آئینۂ تثلیث

خوشتر نیازی

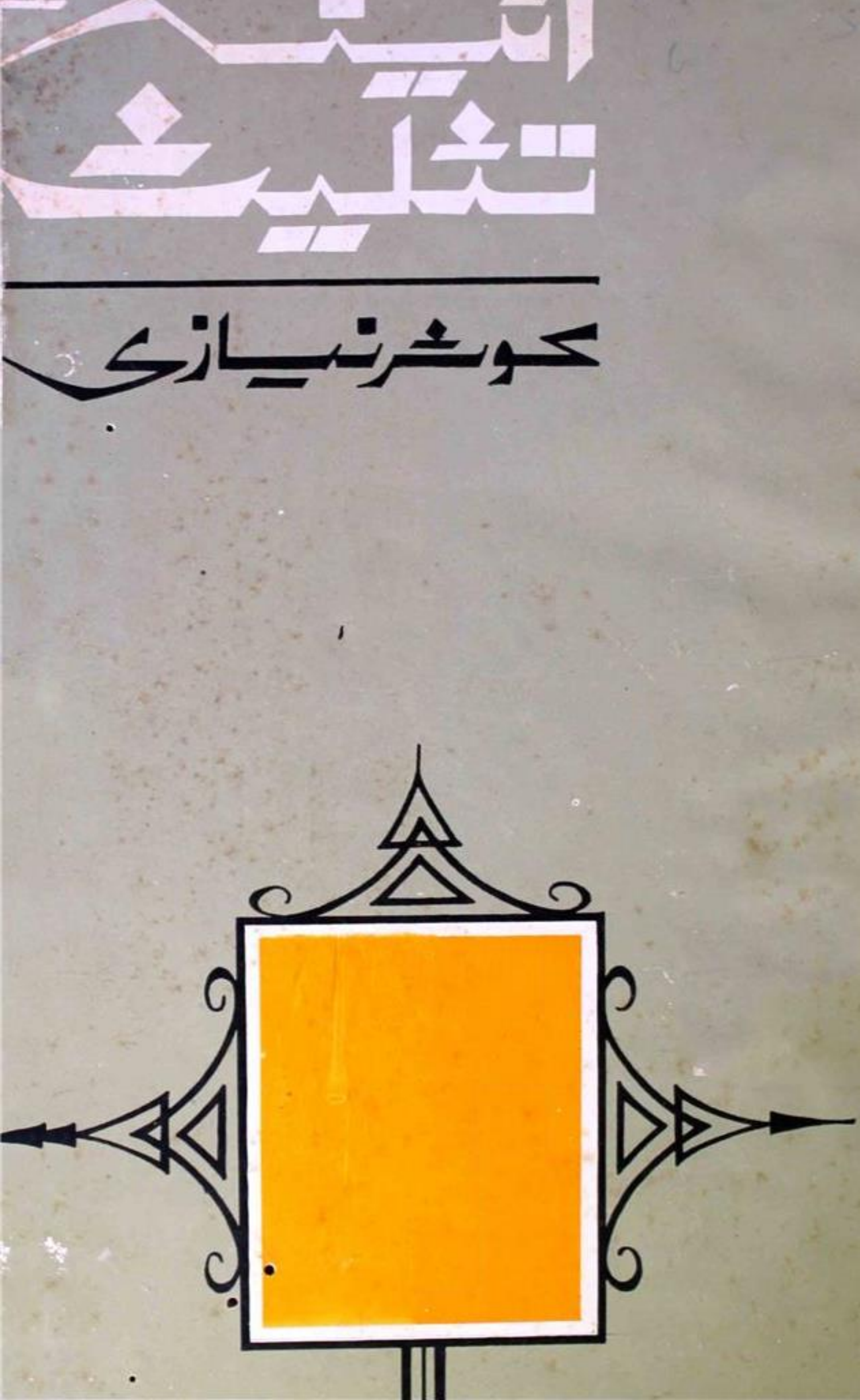

کئی سال ہُوئے جب مولانا کوثر نیازی کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ بعض غیر مُلکی مشنری عیسائی جماعتیں ایسی بھی ہیں جو ہر سال کتنے ہی مذہب سے ناواقف مُسلمانوں کو اِسلام کے خلاف ورغلا کر عیسائی بنا لیتی ہیں۔ یہ اِسلام میں تو ہزار ہزار عیب نِکالتی ہیں مگر عیسائیت کو ہر عیب سے مُبرّا اور پاکیزگی کا مخزن ٹھہراتی ہیں۔ یہ لازمی بات تھی کہ مولانا جیسے حسّاس، فرض شناس اور مخلص مُسلمان کو اِس سے دُکھ ہوتا۔

یہ دُکھ ہی دراصل "آئینۂ تثلیث" کا پہلا اور آخری مُحرّک ہے۔

آئینۂ تثلیث سے مقصود نہ تو کوئی مذہبی مناظرہ ہے نہ مُباحثہ۔ اِس سے مطلوب پاکستان کی عیسائی اقلیّت کی دِل آزاری بھی ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

البتّہ اس کے ذریعے سے اِسلام کی عیب جوئی کرنے والے عیسائی مُبلّغین کے لیے آئینہ فراہم کیا گیا ہے۔

اور آئینہ بہرحال آئینہ ہوتا ہے۔ اور پھر جب یہ مولانا کوثر نیازی جیسے صاحبِ طرز مُصنّف کے ہاتھ میں ہو تو اس پر مُنعکس ہونے والے خط و خال کی کوئی ہیئت اور کوئی کیفیت بھی دُھندلا نہیں سکتی۔

•

•

آئینۂ تشکیک

کوثر نیازی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور

دوسری بار 1973
تعداد 1500
قیمت 6.25

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور باہتمام عبدالحمید خاں پرنٹر پبلشر

فہرست

	حرفِ آغاز	5
1	شجرۂ نسب	9
2	حضرتِ مسیحؑ کی پیدائش	15
3	حضرت مسیحؑ کی تعلیمات	29
	توحید	
	یومِ آخرت پر ایمان	
	کچھ ممانعات	
4	معجزاتِ مسیحؑ	38
5	رفعِ آسمانی یا صلیب؟	48
6	کچھ انجیلوں کے بارے میں	66
	باہمی تضاد	
	کچھ غیر معیاری انداز	

7 بائبل اور نبیِ آخر الزّماں صلّی اللہ علیہ وسلّم 78

8 عقیدۂ تثلیث 101

اناجیل اور تثلیث

بے جا تاویلات

حرفِ آخر 127

حرفِ آغاز

یہ کتاب "آئینۂ تثلیث" میری کئی سال پہلے کی تصنیف ہے۔ اس کی حیثیت کسی نظریاتی بحث و مُباحثہ یا دینی و مذہبی تقابُل کی بالکل نہیں ہے۔ اسے ادیانِ عالم کے ایک طالب علم کے مذہبی مُطالعہ سے زیادہ اہمیت قطعاً نہ دی جائے۔

یُوں بھی میں اس مدرسۂ فکر سے تعلق نہیں رکھتا ہُوں جو ادیانِ عالم کے تقابُل و تناظر کو حاصلِ زِیست قرار دیتا ہے۔ میرے نزدیک اس کائناتِ رنگ و بُو کی ساری خوبصُورتیاں جس طرح قدرتی تنوّع کی رہینِ مِنّت ہیں اسی طرح انسان کی ذہنی کشت کی ساری سرسبزیاں و شادابیاں اس گوناگوں آبیاری کا صدقہ و فیض ہیں جو ابنِ آدم انفرادی طور پر فکرِ نوعِ انسانی کے حضور نذر لایا ہے اور جس طرح ایک ماں اور باپ کی اولاد ہونے کے باوجود چہرہ و مُہرہ کی یکسانیت لازمی امر نہیں ہے، اسی طرح فکرِ انسانی ایک منبع و سرچشمہ سے پھوٹنے کے باوجود ایک جیسا نہیں ہو سکتا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں فکرِ انسانی کا باہم اختلاف قدرت کا ویسا ہی قابلِ قدر عطیہ ہے جیسے کہ اس کی اور بڑی نعمتیں ہیں۔

البتّہ شرط یہ ہے کہ آدمی اس اختلافِ فکر و ذہن کو فساد فی الارض اور امنِ عامّہ کے بگاڑ کا ذریعہ نہ بننے دے۔ وہ بے شک مسجدوں کے پہلُو بہ پہلُو کلیساؤں کو آباد رکھے وہ بے شک حرم کے زیرِ سایہ خرابات جب تک جی چاہے بساتے رکھے۔ مگر نہ کلیسا میں آنے والے مسجدوں کے زائروں سے اُلجھیں اور نہ مسجدوں کے نمازی کلیساؤں کے عقیدت مندوں سے برسرِ پیکار ہوں۔

اور دوسروں کی بات کا تو کیا ذِکر اسلام نے جسے اپنی تکمیل، اپنی صداقت اور اپنی عالمی قدر و قیمت پر بڑا ناز ہے، اُن دنوں جب کہ وہ ایک قوّتِ حاکمہ اور جماعتِ غالبہ

کی مُسلّمہ حیثیت رکھتا تھا، کلیسا کو اپنے پہلو میں اس طرح جگہ دینے کی طرح ڈالی تھی جیسے کلیسا اور اس میں صرف بال برابر فاصلہ حائل تھا۔

یہ کوئی فرضی یا من گھڑت مفروضہ نہیں ہے۔ یہ تاریخِ اسلام کی ایک ہمالیہ اتنی ٹھوس اور وزنی حقیقت ہے اور اس حقیقت کو تاریخ کی باریک بین نگاہ نے تین سو پینسٹھ دن نہیں، دو چار سو ہفتے نہیں پورے پچھتر سال تک مسلسل و متواتر اس طرح دیکھا جیسے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں ساتھ ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔[1]

مورّخ الطبری، مورّخ المدائنی، مورخ البلازری، ابن کثیر، ابنِ اثیر اور ابنِ خلدون کی رُو سے اسلامی سپاہ نے جب آدھے دمشق کو بذریعہ تلوار فتح کیا اور آدھے شہر پر صُلح کے راستے قبضہ حاصل کیا تو دو حصّوں میں بٹ کر دو اطراف سے آگے بڑھتی فوج جس مقام پر مجتمع ہوئی تھی وہ مشہور کنیسائے یوحنّا تھا۔ یہ کنیسائے یوحنّا تیسری صدی عیسوی سے اس وقت تک جب تک ایک طرف سے حضرت خالدؓ بن ولید بہ زورِ تلوار اور دُوسری طرف سے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح بذریعہ صُلح پیش قدمی کر کے اُس تک پہنچے تھے، شام کی عیسائی دُنیا کا سب سے بڑا اور سب سے مُقدّس کلیسا سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی قدر و قیمت نہ صرف شام کے لوگوں کے نزدیک عرشِ الٰہی ایسی تھی، بادشاہانِ رُوم اُسے روم کے بڑے سے بڑے گرجا اتنا مقدس جانتے تھے۔

اگر کوئی اور فاتحِ عالم ہوتا خواہ یہ عیسائی فاتح ہی کیوں نہ ہوتا، وہ کنیسائے یوحنّا کے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑے کی لگام قطعاً نہیں تھامتا۔ وہ اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیتا اور وہ اور اس کے فوجی کلیسا کے صحن میں اپنے گھوڑے دوڑاتے اس طرح نظر آتے

---

[1] تاریخ ابنِ عساکر جزو اوّل ص ۲۱۲ - ابنِ کثیر جز ۹ ص ۱۴۲

جیسے وہ کلیسا کے پتھروں سے اپنے حضور اعترافِ عجز کرانا چاہتے ہوں ۔ مگر جناب خالدؓ بن ولید جس دین کے علمبردار بن کر یہاں آئے تھے وہ اس دنیا کے تختے پر سب سے زیادہ رواداری کا مذہب ہے۔ انھوں نے اپنے گھوڑے کی لگام ایک دم روک لی۔ گھوڑے سے اترے اور اپنے ساتھیوں سے کہا "مجھے مشورہ دو"

تاریخ نے اعتراف کیا ہے کہ جب یہ صورتِ حال پیش آئی تھی تو دمشق کے بعض واقفانِ حال نے جناب خالدؓ بن ولید کے سامنے اس کلیسائے یوحنّا کی ساری قدیم تاریخ حرف بہ حرف بیان کر دی تھی۔

انھوں نے جناب خالدؓ بن ولید سے کہا تھا کہ یہ کنیسائے یوحنّا جس جگہ بنا ہے یہاں پہلے ایک بہت بڑا اور انتہائی مقدّس یونانی مندر تھا۔ جس کے تقدّس کی شہادت خود آسمانی دیوتاؤں نے دی تھی۔ مگر قسطنطین جب تختِ رومہ پر بیٹھا اور اس پر عیسائیت کی تبلیغ کا جنون سوار ہوا تو اس نے معبد کو توڑ دیا اور اسے بپتسمہ دے کر کنیسائے یوحنّا کا نام بخشا۔ اس وقت سے یہ کنیسائے یوحنّا ہے۔[1]

گویا یہ داستان اس امر کی تاریخی سند تھی کہ جناب خالدؓ بن ولید عیسائی فاتح قسطنطین کے نقشِ قدم پر چل کر اس کلیسا کو "مشرّف بہ اسلام" کر لیتے مگر وہ ایسی کسی تاریخی روایت کو اپنے لیے سند نہیں سمجھتے تھے۔

ان کے نزدیک تو جناب ابوبکرؓ صدیق کی صرف یہ ہدایت تھی "اگر وہ تم سے لڑیں تو تمھیں ان سے لڑنے کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ تم پر تلوار اٹھائیں تو تم بھی ان سے تلواریں بے نیام کر سکتے ہو۔ لیکن اگر وہ صلح کر لیں تو تمھیں ان کی جانوں اور مالوں کو امان دینا ہوگی۔"

---

[1] تاریخ ابنِ عساکر جزاوّل ص ۲۱۳ ۔ ابنِ کثیر جز ۹ ص ۱۴۲

بلاشُبہ یہاں صُورتِ حال اُلجھی ہوئی تھی۔ آدھے شہر نے اُن سے قدم قدم پر جنگ کی تھی۔ تلواروں سے تلواروں اور نیزوں سے نیزوں کو بھڑایا تھا۔ اور کوئی دقیقہ مدافعت کا فروگذاشت نہیں کیا تھا۔

مگر دُوسرے آدھے دمشق کے اہالیان نے صلح کی راہ اختیار کی تھی اور جناب خالدؓ بن ولید کے حملہ کی شدت سے متاثّر ہو کر عجز و نیاز مندی کی تصویر بن کر جناب ابو عبیدہؓ بن جراح سے جو غربی دروازہ پر مامُور تھے امان طلب کرلی تھی اور ہتھیار پھینک دیئے تھے۔

جناب خالدؓ بن ولید کے ہر سپاہی کا اصرار تھا کہ ہم نے شہر دمشق کو بذریعہ تلوار فتح کیا ہے اور عیسائیوں نے جو صُلح کی ہے وہ ہماری تلواروں کی کاٹ کے سامنے عاجز آن کر کی ہے، اس لیے پُورے شہر کو بزورِ تلوار فتح کیا ہوا ٹھہرایا جائے اور کنیسائے یوحنا کو مسجد کے طور استعمال کرنے دیا جائے۔

مگر محمّدِ عربی سیّدنا و مولٰینا صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قائم کیے ہوئے معیارِ عدل کے پیشِ نظر جناب خالدؓ بن ولید نے کنیسائے یوحنا کے نصف میں ایک بال برابر خط کھینچ دیا۔ مورخ ابنِ عساکر اور ابنِ کثیر راوی ہیں کہ کنیسائے یوحنا کا مشرقی حِصّہ مفتوحہ بہ زورِ تلوار ٹھہر کر مسلمانوں کے لیے مسجد بنا اور غربی حِصّہ مقبوضہ بہ صلح قرار پا کر عیسائیوں کا معبد رہا[1]۔ برابر پچھتر سال تک جب تک ولید اموی نے عیسائیوں سے نیا معاہدہ نہیں کیا یہ صورتِ حال قائم رہی۔ عیسائی اور مسلمان اتنی لمبی مدّت تک ایک ساتھ اس معبد میں داخل ہوتے اور اپنے اپنے انداز میں ربِّ کائنات کے حضُور اپنی بندگی کا اظہار کرتے[2]

---

[1] ابنِ کثیر جز ۹ ص ۱۴۳۔ السیوطی حسن المحاضر ص ۷۰۴۔ ابنِ جبیر ص ۲۶۲

[2] ابنِ شاکر جز ۲ ص ۱۴۳۔ حسن المحاضر ص ۷۰۴۔

دمشق ہی میں نہیں ہم نے یہ رواداری قرطبہ میں بھی صفحۂ عالم پر نقش کی تھی اور قرطبہ کے سب سے بڑے کلیسا کو فاتح قرطبہ ہونے کے باوجود بڑی مُدّت تک آدھے کلیسا اور آدھی مسجد کے طور پر استعمال کیا تھا[1]

مَیں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کا امنِ عامہ یہ آدھے کلیسا اور آدھی مسجد کی روایت دہرائے بغیر فروغ نہیں پا سکتا۔ امنِ عالم کو بڑھانے اور وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے انسان نے اور بہت سی راہیں تلاش کر لی ہیں۔ یہ راہیں بھی آزمائی جا سکتی ہیں بشرطیکہ نئے دور کا آدمی یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ کلیسا اور مسجد آدمی کے وقار اور آبرو کو بڑھانے کے لیے وجود میں آئے تھے۔ ان کی تشکیل آدمی کی دل آزاری، شکر رنجی اور بے انصافی کے لیے قطعاً نہیں ہوئی تھی۔

اور حقیقت پوچھی جائے تو نہ وہ کلیسا صحیح معنوں میں کلیسا ہے جو اپنے در و دیوار کو آدمیّت کے فروغ کے لیے استعمال میں نہیں لاتا اور نہ وہ مسجد صحیح اعتبار سے مسجد ہے جو خونِ انسانی سے اپنی رونق بڑھاتی ہے۔ اصل کلیسا وہ ہے جو آدمیت کے درخت کی ٹھیک ٹھیک آبیاری کرتا ہے۔ اور اصل مسجد بھی وہی ہے جس سے نسلِ انسانی راحت پاتی اور سکھ چین سے آشنا ہوتی ہے۔

یوں میرے نزدیک کلیسا کو بھی برابر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بڑائی کا ڈھنڈورا پورے زور سے جس طرح چاہے پیٹے اور مسجد بھی اس بات میں آزاد ہے کہ اپنی عظمت کے راگ خوب گائے بشرطیکہ کلیسا اور مسجد دونوں ان حدود کا احترام کریں جو آدمیّت نے ان کے گرد کھینچ دی ہیں۔

یقیناً کلیسا اور مسجد باہم تقابل کا بھی حق رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو آئینہ بھی

---

[1] البیان المغرب جز ۲ ص ۱۹ - مقری ص ۲۵۵

دکھا سکتے ہیں۔ یہاں بھی شرط یہ ہے کہ مقصود دل آزاری اور شکر رنجی نہ ہو۔

یہ کتاب اسی حق کو استعمال کر کے لکھی گئی ہے اور اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ یارانِ کلیسا نے پاکستان میں اپنے دین کی تبلیغ کا جو انداز پچھلے پچیس سال سے اختیار کیا ہے وہ انصاف کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔

میں نے اپنی اس کتاب میں عیسائیت کے اصل حقائق کے چہرے سے پردہ ہٹا کر صرف ان یارانِ کلیسا کو آئینہ دکھایا ہے جو مسیح کی بھیڑوں میں اضافے کی خاطر مسجدوں کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھتے اور آدمیّت کی نجات کے بہانے ایسی گمراہیاں عام کرنے میں دن رات مشغول ہیں جن سے آدمیّت کی بلند قدریں بری طرح مجروح ہو رہی ہیں۔ اور بھولے بھالے آدمی ایسے اندھیروں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں جن کے آگے پیچھے روشنی کی کوئی کرن دُور دُور تک موجود نہیں ہے۔

حاشا و کلّا اس سے پاکستان میں بسنے والی امن پسند عیسائی برادری کی دل آزاری قطعاً مقصود نہیں ہے۔

وہ ہمارے نزدیک بے حد قابلِ احترام اور ہر لحظہ قابلِ لحاظ ہے اور اسے اپنے مذہبی حدود کے اندر رہ کر اپنی زندگی سنوارنے کا ہر وہ حق حاصل ہے جس سے پاکستان کے مسلمان شہری بہرہ مند ہیں۔

کوثر نیازی

۴۴۹ مارغلہ بلز۔ اسلام آباد

باب 1

شجرۂ نسب

کسی بطلِ جلیل کا تذکرہ لکھتے وقت ایک مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا شجرۂ نسب بیان کرے۔ حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کو لے لیجیے انھوں نے عام طور پر آپؐ کے شجرۂ طیبہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصّہ آپؐ سے لے کر عدنان تک ہے اور عدنان کا نام آپؐ کے آباؤ اجداد میں بائیسویں نمبر پر آتا ہے۔ اس حصّہ کے بارے میں آپؐ کے جملہ سیرت نگار متفق ہیں۔ کتاب الاستیعاب میں ہے۔

هٰذا ما لم يختلف فيه احد من الناس[1]

یعنی اس میں کسی ایک آدمی کو بھی اختلاف نہیں۔ دوسرا حصّہ عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام تک منتہی ہوتا ہے۔ اس میں آپؐ کے تذکرہ نگاروں کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ اسحٰق اور ابنِ جریر اور ایک روایت کے مطابق امام سخاوی اس کا بیان کرنا جائز سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے اصحاب اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ یوں بعض محققین نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک آپؐ کا شجرۂ نسب مکمل کرنے میں بڑی عرق ریزی اور تحقیق و تفحص سے کام لیا ہے۔ بہرحال اتنی بات تو طے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیس پشتوں تک کے نام اور واقعات آج بھی تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں۔

اس کے برعکس جب ہم حضرت مسیح علیہ السّلام کا شجرۂ نسب معلوم کرنے کے لیے اناجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بے حد مایوسی ہوتی ہے۔ مرقس اور یوحنّا نے تو اس کا ذکر ہی ضروری نہیں سمجھا۔ جناب متی اور جناب لوقا نے اس مؤرخانہ فریضہ کو انجام دینے کی

---

[1] استیعاب جزاول ص

کوشش کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے لیے چند پشتوں کا ذکر اور ان کے موٹے موٹے واقعات کا بیان کوئی اتنا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ مگر مقامِ افسوس ہے کہ انھوں نے بھی محض چند نام لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے کسی کی نسبت بھی کچھ اور نہیں لکھا۔ اس شجرہ کا سرنامہ جناب متی نے یہ تجویز فرمایا ہے،

"یسوع مسیح بن داؤد ابنِ ابرہام کا نسب نامہ"

گویا ع عشق کی اک جست نے طے کر دیے قصّے تمام

حضرت مسیح اور حضرت داؤد علیہما السّلام کے درمیان ۲۶ پشتیں اور حضرت داؤد و حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان ۱۲ پشتیں ہیں مگر متی صاحب نے بیک جنبش یہ دور دراز کا فاصلہ آناً فاناً طے کر لیا۔

اس نسب نامہ کا خاتمہ متی کے الفاظ میں اس طرح ہوتا ہے:

"یعقوب سے یوسف پیدا ہُوا۔ یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہُوا"

متی صاحب کے نزدیک حضرت مریمؑ کے شوہر کا نام یوسف تھا۔ مگر وہ مانتے یہ ہیں کہ یسوع مسیحؑ مریمؑ کے بیٹے تو تھے مگر یوسف کے نہ تھے۔ اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر جناب مسیحؑ ان یوسف کے فرزند ہوں تو تب تو یہ شجرۂ نسب واقعی انھی کا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ یوسف اولادِ داؤد ہیں اور چونکہ حضرت مسیحؑ یوسف کے بیٹے تھے اس لیے وہ بھی اولاد داؤد ہیں۔ مگر اتنی بات تو متی صاحب اور ان کے دوسرے تمام ہم نوا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ حضرت مریمؑ کے بیٹے تھے، یوسف کے نہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر یوسف صاحب کے شجرۂ نسب کو حضرت مسیحؑ کا شجرۂ نسب کیونکر ٹھہرایا جا رہا ہے۔ اگر متی صاحب کو حضرت مسیح کا شجرہ لکھنا تھا تو عیسیٰ ابنِ مریمؑ سے شروع کرتے اور اس کے بعد حضرت مریم کا شجرۂ نسب لکھ دیتے تو تب بھی بات بن جاتی۔

یہ تو تھا جنابِ متی کا کارنامہ۔ اب ذرا جنابِ لوقا کے لکھے ہوئے شجرہ پر ایک نگاہ ڈالتے چلیے۔

جنابِ لوقا نے اپنی انجیل کے باب ۳، فقرہ نمبر ۲۳ سے لے کر ۳۸ تک یسوع مسیحؑ کا شجرہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"جب یسوع خود تعلیم دینے لگا، قریباً تیس سال کا تھا اور یوسف کا بیٹا تھا اور وہ عیلی کا۔"

اصحابِ اناجیل کی اس ژرف نگاہی کی داد دیجیے، شجرہ نگاری کی وہی بنیادی غلطی جس کا ارتکاب حضرت متی نے فرمایا تھا، یہاں بھی اپنی پوری شان سے موجود ہے۔ صرف فرق اتنا پڑ گیا ہے کہ متی یوسف کے باپ یعنی مسیح کے دادا کا نام یعقوب بتاتے ہیں اور لوقا عیلی۔ اب ظاہر ہے ان دونوں ناموں میں سے ایک غلط ہے۔ اندازہ فرمایئے دو شجرہ نویس ہیں اور ان کی یہ کیفیت ہے کہ حضرت مسیح کے دادا کے نام تک پر متفق نہیں۔ ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے والوں کی کاوش کا حال تو آپ دیکھ چکے۔ اب ان لوگوں کی محنت ملاحظہ فرمایئے جو عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح کی عظمت کے منکر ہیں۔

مسلمان اہلِ علم نے حضرت مریمؑ کے واسطہ سے حضرت مسیح علیہ السّلام کا شجرہ لکھا ہے۔ اگرچہ صاف اور واضح، دو اور دو چار کی طرح کی معلومات نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے ہاں ناموں میں باہم اختلاف پایا جاتا ہے مگر اتنی بات بہرطور ان کے ہاں مُسلّم ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ محترمہ حنہؓ اور ان کے والد ماجد جناب عمران، حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ابنِ اسحاقؒ صاحبِ مغازی نے جناب عمران کا شجرہ

نسب اس طرح بیان کیا ہے:

"عمران بن یاشم بن میثا بن جزقیا. بن ابراہم بن عزریا بن نادش. بن اجر بن یہوا بن نازم بن مناسط بن الیشا بن ایاز بن رخیعم. بن سلیمان بن داؤد علیہما السلام۔"

باب 2

حضرت مسیحؑ کی پیدائش

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ عیسائیوں کے نزدیک خاص الخاص اہمیّت کا حامل ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر یہ لوگ عقیدۂ ابنیت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس لیے موضوعِ زیر بحث کی نزاکت کے پیشِ نظر ہم قدرے تفصیل سے اس پر گفتگو کریں گے اور اسی ذیل میں یہ اعتقادی بحث آپ سے آپ سامنے آجائے گی کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی خدا کے بیٹے تھے یا انجیل میں ان کے متعلق "ابن اللہ" کے الفاظ استعمال کر کے کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم اور اناجیل نے حضرت مسیح علیہ السّلام کی پیدائش کا واقعہ اپنے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے قرآنِ حکیم سے اس واقعہ کی تفصیل پر غور فرمائیے۔ سورۂ مریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۚ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝

لے الہدایۃ والنہایۃ ابنِ کثیر ج ۲۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ (سورہ مریم۔ رکوع ۲

"اور مذکور کر کتاب میں مریمؑ کا جب وہ اپنے لوگوں سے ایک شرقی رُخ مکان میں جدا ہوئیں۔ پھر ان لوگوں کے سامنے سے انھوں نے پردہ کر لیا۔ پھر ہم نے ان کے پاس اپنے فرشتہ خاص کو بھیجا۔ وہ ان کے سامنے بھلا چنگا انسان بن کر ظاہر ہوا۔ وہ بولیں، میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو خدا ترس ہے۔ فرشتہ نے کہا، میں تو بس تمھارے پروردگار کا ایک ایلچی ہوں تاکہ تمھیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ وہ بولیں، میرے لڑکا کیسے ہو جائے گا۔ درآنحالیکہ نہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں بدچلن ہوں۔ فرشتہ نے کہا یوں ہی ہوگا۔ تمھارے پروردگار نے کہا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے اور (یہ اس لیے بھی) تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں اور اپنی طرف سے سببِ رحمت اور یہ ایک طے شدہ بات ہے۔ پھر ان کے حمل قرار پا گیا۔ پھر وہ اسے لیے ہوئے کہیں ایک اور جگہ چلی گئیں"

قرآنِ حکیم کی ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنی خاص نشانی بنانے کے لیے بن باپ کے پیدا کیا۔ جب فرشتے نے حضرت مریم کو آکر پیدائشِ مسیح کی بشارت سنائی تو وہ پکار اٹھیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں شادی شدہ نہیں، ایک عفیفہ ہوں۔ پھر میرے لڑکا کیوں کر ہوگا۔ فرشتے نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کچھ مشکل نہیں۔ وہ جب کسی شے کے لیے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے۔

عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی نادر الوقوع پیدائش دیکھ کر ان کے متعلق عجیب و غریب عقائد گھڑ لیے مگر قرآن نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ:

إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ
مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

"اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال تو آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔"

یعنی اگر بغیر باپ کے پیدا ہو جانا حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیتا ہے تو حضرت آدم علیہ السّلام کے متعلق تم کیا کہو گے جن کی نہ ماں تھی نہ باپ۔ جب اتنی مُحیّر العقول ولادت کے باوجود تم حضرت آدم علیہ السّلام کو خدا بنانے کی بجائے انسانِ اوّل قرار دیتے ہو تو پھر حضرت مسیحؑ جن کی پیدائش حضرت آدمؑ کے مقابلے میں اتنی حیران کُن نہیں، تمھارے نزدیک خدا کے بیٹے کیونکر ہو گئے؟

عیسائیوں سے پہلے جب ہم اہلِ یُونان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یونانی دہم پرستوں کے ہاں بھی متعدد دیوتاؤں اور دوسرے مشاہیر کو خدا کا بیٹا مانا جاتا تھا۔ اور اس عقیدہ کی بنیاد یہ تھی کہ وہ سب کے سب بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اہلِ یُونان کے زیرِ اثر اس عقیدہ کو تو سینے سے لگا لیا لیکن وہ یہ بھول گئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بعض دوسرے لوگوں کے متعلق بغیر باپ کے پیدا ہونے کا جو دعویٰ کیا گیا وہ اس بات کی شہادت بھی فراہم کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کسی کو بغیر باپ کے پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے واقعات اس کے کارخانۂ قدرت میں معمول کے خلاف تو ضرور نظر آتے ہیں، لیکن وہ ناممکن الوقوع ہرگز نہیں۔

۱- مشہور فاضل ڈریپر نے اپنی کتاب Conflict Between Religion and science میں افلاطون کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السّلام سے ۴۲۹ سال پہلے یونان کے دارالسلطنت ایتھنز میں پیدا

ہوئے ان کی والدہ پیریکٹیشن کی منگنی ایریس سے ہوئی مگر قبل اس کے کہ وہ اکھٹے ہوتے پیریکٹیشن اپولو سے حاملہ پائی گئی جو حکمت کدۂ یونان کا رُوح القدس ہے۔ اس دیوتا نے ایریس کو خواب میں آکر دھمکی دی کہ دیکھ تیری منگیتر کے رحم میں میرا بچہ ہے۔ تو اس کے پاس مت جائیو، کیونکہ تجھے "رُوح القدس" کی عزت کرنی چاہیئے۔ یہی سبب ہے کہ افلاطون کے مصری شاگرد افلاطون کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ تاریخ کا یہ لطیفہ قابلِ غور ہے کہ نصرانیت اپنے فروغ کے لیے ایک یونانی فرمانروا "کانسٹن ٹائن" کی بطورِ خاص مرہونِ احسان ہے جو اپولو کو سورج دیوتا تسلیم کرتا تھا اور اس عقیدہ کا زبردست پرچارک تھا کہ یہی سورج دیوتا افلاطون کا باپ ہے۔ جب کانسٹنٹائن عیسائی ہوگیا تو اس نے عیسائیت کو ریاست کا مذہب ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا منوانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا۔

۲۔ اہلِ رُوم اور یونانیوں کے نزدیک ہرکیولیس کسی انسان کا بیٹا نہ تھا۔ اس کی پیدائش ذیوس دیوتا کے ذریعے ہوئی جسے روح القدس کا قائم مقام دیوتا سمجھا جاتا ہے

۳۔ اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ اہلِ یُونان کے ہاں برکاس دیوتا کے متعلق مشہور ہے۔ اس کی ماں سیملی تھیبس کے حاکم کیدماس کی بیٹی تھی۔ پیٹر دیوتا نے اپنی رُوح سیملی میں پھُونک دی جس سے برکاس دیوتا دُنیا میں آیا۔ یُونان کے دانشور فلاسفر اسی دیوتا کو شراب کا دیوتا کہتے ہیں۔ اسی لیے انگریزی زبان میں آج بھی پرلے درجے کے مےخوار کو Bacchanalian بکے نے لین کہتے ہیں۔

۴۔ ڈریپر یہ بھی بتاتے ہیں کہ شہر رُوما کے بانی رومولس کی ماں دی سکویا بھی بن بیاہی ہی تھی کہ خُداوند خُدا کی عنایت یا رُوح القدس کی قدرت سے اسے فرزند عطا ہوا اور اسی کے لختِ جگر کے نام پر روم کی بنیاد رکھی گئی۔ ۵۔ مشہور مغربی مورخ اور

فاضل گبن کی کتاب: The Decline and Fall of Roman Empire
(زوال و سقوطِ سلطنتِ رُومہ) اور ڈریپر صاحب کی مذکورہ بالا تصنیف میں لکھا ہے کہ سکندر اعظم نے دارا بادشاہ کی جس بیٹی سے شادی رچائی تھی اس کی والدہ ایمپی ایس کو یونانی زادۂ رُوح القدس تسلیم کرتے تھے۔

۶ - فیثا غورث، حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ سو چھ سال پہلے آئے ان کے متعلق بھی یونانی یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور خدا کے بیٹے ہیں اس سلسلے میں تاریخ کی تمام مثالوں کا حصر و احاطہ مقصود نہیں۔ ہم دکھانا یہ چاہتے تھے کہ بن باپ کے پیدا ہونے والے بچوں کی شہادت تاریخ کثرت سے دے رہی ہے۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح یونانی توہم پرستوں نے اپنے بزرگوں کو کنواری ماؤں کے پیٹ سے تولّد ہوتے دیکھ کر انھیں خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا، اسی طرح عیسائیوں نے بھی آخر کار حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا

یہ تو خیر بزرگوں کی باتیں ہیں۔ خود ہمارے دور میں بھی کبھی کبھی ایسے واقعات دیکھنے اور سننے میں آجاتے ہیں کہ عقلِ انسانی کوئی تاویل نہیں کر سکتی اور انھیں سوائے ایک کرشمۂ قدرت کے اور کسی چیز پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خبر پاکستان کے تقریباً تمام ممتاز انگریزی اخبارات میں انگلستان کے ایک ہفتہ وار طبّی رسالہ The Lancet کے حوالے سے شائع ہو چکی ہے کہ ایک غیر شادی شدہ عورت کے ہاں بچی پیدا ہوئی اس کا دعویٰ ہے کہ یہ کسی مرد کی قربت کا نتیجہ نہیں۔ ڈاکٹروں کی ایک باقاعدہ ٹیم نے اس کیس کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ہر ممکن سائنٹفک طریقہ اختیار کیا مگر آخرِ کار وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اس دعوے کی تردید کے لیے ان کے پاس کوئی وجہِ جواز موجود نہیں۔ یہ خبر مع ترجمہ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

London June 29 (1956) The weekly Professional Medical Journal "The Lancet" published details on Friday of the first undisputable case of part henogensis or virgin birth in Britain. The review published the case of a young woman whose name was not revealed, who claimed her daughter was the result of a virgin birth. A team of doctors studied the case and wrote "The Lancet" after applying very known scientific test that the doctors were unable to contradict the mother's claim. One test revealed the bloods of mother and daughter were identical. The organic bulid up of the mother was also the same as that of the daughter in every detail said "The Lancet" (APP.)

"جمعہ کے روز طبّی پیشہ کے ہفتہ وار جریدہ "لانسٹ" میں برطانیہ کے پہلے اور غیر متنازعہ "بن باپ" کی پیدائش کے مقدمہ کی تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ ان تفصیلات کے مطابق ایک دوشیزہ نے جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی بچی کی پیدائش کسی باپ کے بغیر عمل میں آئی ہے۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے ہر سائنٹفک طریقہ استعمال کرنے کے بعد اس جریدہ کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ وہ اس دعویٰ کی تردید کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ جریدہ میں شائع شدہ تفصیلات کے مطابق ایک طریقۂ امتحان کی رُو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ماں اور بچی کے خون میں یکسانیت ہے اور ان دونوں کی جسمانی بناوٹ ایک سی ہے۔"

ان توضیحات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کو بغیر باپ کے پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس نے لاکھوں فرشتوں کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔ حضرت آدم علیہ السّلام کی تخلیق

اسی طرح عمل میں آئی۔ حوّا اسی طرح پیدا ہوئیں۔ بے شمار حشراتُ الارض اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ پھر اگر اس نے اپنے ایک پیغمبر کو مجسّم نشانی بنانے کے لیے باپ کے بغیر دنیا میں بھیج دیا تو اس پر تعجّب کیسا؟ اس کی بنیاد پر اسے خدا کا بیٹا کیوں قرار دیا جائے؟ مگر عیسائی حضرات کی گمراہی کا ایک بنیادی سبب پیدائش مسیح کی عجیب و غریب نوعیّت ہے اور وہ یہیں سے بھٹک کر حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

"لُوقا" اپنی انجیل کے باب اوّل فقرات ۲۶ سے ۳۵ میں بیان کرتے ہیں:

"جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیلی کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤدؑ کے گھرانے کے ایک مرد یوسف سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریمؑ تھا اور فرشتہ نے اس کے پاس اندر آ کر کہا، سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے۔ خداوند تیرے ساتھ ہے۔ وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی، یہ کیسا سلام ہے؟ فرشتہ نے اس سے کہا، اے مریمؑ! خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے۔ اور دیکھ تو حاملہ ہو گی اور تیرے بیٹا ہو گا۔ تو اس کا نام یسُوع رکھنا۔ وہ بزرگ ہو گا، باپ داؤدؑ کا تخت اُسے دے گا اور یعقوب کے گھرانے پر ابد تک بادشاہی کرے گا۔ اس کی بادشاہی کا آخر نہیں ہو گا۔ مریم نے فرشتہ سے کہا، یہ کیونکر ہو گا جب کہ میں مرد کو نہیں جانتی۔ فرشتے نے جواب میں اس سے کہا روحُ القدس تجھ پر نازل ہو گا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی۔ اور اس سبب سے وہ مولُودِ مقدّس خُدا کا بیٹا کہلائے گا۔"

یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ:

۱۔ جبرائیل ناصرہ میں مریمؑ کے پاس گیا۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مریمؑ کہاں تھیں؟ کسی

معبد میں تھیں یا اپنے گھر میں ؟

۲۔ فرشتے نے سلام کیا، کلام کیا۔ اور یہ کہا تجھ پر خدا کا فضل ہوا۔

۳۔ مریمؑ یہ سن کر سوچنے لگیں (خدا معلوم ان کی اس کیفیت کا راز لوقا پر کیوں کر منکشف ہوا) گھبرائیں، سوچ میں پڑ گئیں۔ ڈر گئیں۔

۴۔ فرشتہ نے فضل کی تشریح کی کہ مریم حاملہ ہوں گی، بچہ جنیں گی۔ فرشتہ نے اس کا نام یسوعؑ رکھنے کی ہدایت کی۔

۵۔ وہ بزرگ ہوگا۔ خدا اسے داؤدؑ کا تخت دے گا۔ یعقوبؑ کے گھرانے میں اس کی بادشاہی ابدی ہوگی (ظاہر ہے کہ یہ فضل وہ وعدہ ہے جو شرمندۂ وفا نہیں ہوا۔ اس وقت تک انھیں ابدی چھوڑ، عارضی، وقتی، ہنگامی بادشاہی بھی نہیں ملی۔)

۶۔ بیٹے کی نسبت یہ توضیح کی کہ مریم پر روح القدس نازل ہوگا۔ (معلوم ہوا روح القدس جبرائیل نہیں) اس کا نزول ہوگا۔ خدا کی قدرت سایہ ڈالے گی اور اس سے بیٹا ہوگا۔ وہ خدا کا بیٹا کہلائے گا۔ قارئین غور فرمائیں یہ کتنی بے ربط اور کیسی بے جوڑ عبارت ہے۔

۷۔ حضرت مریمؑ باحیا ہیں، باشعور ہیں۔ ان کی منگنی یوسف سے ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ امر تو بدیہی ہے کہ مرد کو جانتی ہیں۔ بایں ہمہ جبریلؑ سے یہ فرماتی ہیں:

"لڑکا کیوں کر ہوگا جب کہ میں مرد کو نہیں جانتی۔"

اس فقرے میں آپ نے حیا میں ڈوب کر اپنا مطلب ادا کیا ہے۔ معمولی فہم کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سوال فطری ہے حضرت جبرائیل کا فرض تھا کہ اس کا جواب دیتے اور جواب بھی ایسا دیتے کہ اس سے حضرت مریمؑ کی تسلّی ہو جاتی۔ مگر جواب کیا ملتا ہے، "تجھ پر روح القدس نازل ہوگا۔" سوال یہ ہے کہ کیا خود جبرائیل نازل نہیں ہوتے تھے؟ پھر یہ کہنا کہ خدا کا سایہ اس پر ہوگا، اس کا بچے کی ولادت سے کیا ربط ہے؟ عقل کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ خدا نے حضرت مریمؑ کے اس فطری سوال کا جواب جبرائیل کو نہ

سکھایا ہو۔ معلوم ہوتا ہے متی صاحب بھول گئے۔ خود مسیحؑ نے بھی اس کی توضیح نہیں کی۔ یہ ضرور کہا کہ ان باتوں کا جواب رُوحِ حق دے گا۔ جواب دینے والے کا انتظار کرو۔

حُسنِ ظن سے کام لیا جائے تو البتہ یہاں ان الفاظ کا ایک مناسب مفہوم ضرور متعیّن کیا جا سکتا ہے۔ انجیل کا عام اندازِ بیان ہے کہ وہ نیکو کاروں کے لیے "خُدا کے بیٹے" اور خُدا کے لیے "باپ" کے الفاظ جگہ جگہ استعمال کرتی ہے۔ انجیل کے لاتعداد اقتباسات ایسے ہیں جن میں ابن اللہ کے الفاظ انھی مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اگر ان مقامات پر اسے حقیقی مفہوم میں لینے کی زبردستی کی جائے تو دیکھنے والے کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ متی باب ۵، فقرہ نمبر ۹ میں ہے:

"مبارک ہیں جو صلح کراتے ہیں۔ کیوں کہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔"

اگر انجیل میں "خدا کا بیٹا" کے الفاظ سے دھوکا کھا کر ہمارے عیسائی دوست کسی کو سچ مچ خدا کا بیٹا بنانے پر تُل جائیں تو یہاں بڑی دقت پیش آئے گی۔ ہر وہ شخص جو صلح کرانے والا ہے، خدا کا بیٹا بن جائے گا۔ اس کے بعد صرف مسیحؑ ہی اکیلے خدا کے بیٹے نہیں ہوں گے۔ اللہ میاں کو زبردستی بیٹوں کی ایک فوجِ ظفر موج کا باپ بنانا پڑے گا۔

۲۔ جناب مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اپنے ستانے والے کے لیے دعا کرو۔ تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے، بیٹے ٹھہرو۔" (باب ۵، فقرہ نمبر ۴۵)

۳۔ حضرتِ مسیح علیہ السلام ہدایت فرماتے ہیں:

"اگر تم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو۔ کیا غیر قوموں کے لوگ بھی ایسا نہیں کرتے پس چاہیئے کہ تم کامل ہو۔ جیسے تمہارا آسمانی باپ کامل ہے۔" (فقرہ نمبر ۴۷، ۴۸)

ہدایت یہ فرمائی کہ سب کو سلام کرو، یہی تمھارے آسمانی باپ کا شیوہ ہے۔ وہ کامل ہے تم بھی کامل بنو۔ معلوم ہوا کہ سب کو سلام کرنا ممکن ہے۔ لہٰذا کامل ہونا بھی ممکن ہے اور جو کامل ہے وہ آسمانی باپ کا فرزند ہے۔

۴۔ باب ۹ میں ہے:

"ایک مفلوج چارپائی پر پڑا تھا۔ یسوع نے مفلوج سے کہا، بیٹا! خاطر جمع رکھ۔ تیرے گناہ معاف ہوئے۔ مفلوج تندرست ہو کر گھر چلا گیا۔"

متی کے بقول یسوع نے یہ کام اس لیے کیا تاکہ یہودیوں کے فقیہوں پر یہ ظاہر ہو جائے کہ:

"ابنِ آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ مفلوج یسوع کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔ آپ نے اسے پیار کی بنا پر بیٹا کہا۔ اسی طرح اگر انجیل میں کسی کے لیے خدا کا بیٹا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو اس کی بنیاد شفقت و عنایت ہوگی، حقیقت نہیں ہوگی۔

۵۔ اسی باب کے فقرات ۲۵، ۲۶، ۲۷ ملاحظہ ہوں:

"یسوع نے کہا، اے باپ، آسمان اور زمین کے خدا میں تیری حمد کرتا ہوں۔ تو نے یہ باتیں داناؤں اور عقل مندوں سے چھپائیں اور بچوں پر ظاہر کیں۔"

اگر یہاں "بچہ" کا لفظ حقیقی معنوں میں لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ مسیحؑ خدا کے بچے ہیں، حواریانِ مسیحؑ خدا کے بچے ہیں اور ان کے جملہ ارادت کیش خدا کے بچے ہیں۔

۶۔ باب ۲۳، فقرات ۹، ۱۰، ۱۱ میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا:

"تم سب بھائی ہو، اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیوں کہ تمھارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے۔"

ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السّلام کے سارے شاگرد سگے بھائی نہیں وہ مسیحی بھائی ہیں ان کا رشتہ زمینی نہیں آسمانی ہے۔ جسمانی نہیں روحانی ہے۔ انھیں فرمایا گیا ہے کہ وہ زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کیا جسمانی لحاظ سے کوئی ان کا باپ نہ تھا؟ تھا اور ضرور تھا تو معلوم ہوا کہ خدا ان کا روحانی باپ ہے۔ اور یہی روحانی باپ مسیح علیہ السلام کا بھی باپ ہے۔

۷۔ جناب یوحنّا اپنی تصنیف کے بابِ اوّل میں لکھتے ہیں:

"جتنوں نے اسے قبول کیا، اس نے انھیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا۔ یعنی انھیں جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے نہ انسان کے ارادہ سے بلکہ خدا سے پیدا ہوتے۔"

کتنے واضح، صاف اور حتمی الفاظ ہیں۔ مسیح خُدا کا فرزند اس لیے ہے کہ مقبولِ خُدا ہے۔ اتنا مقبول ہے کہ جو اسے مان لیتا ہے وہ بھی خدا کا فرزند بننے کا حق دار ہو جاتا ہے۔ وہ خون سے، جسم سے، انسان کے ارادے سے نہیں خُدا سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسیح اور ان کے ارادت کیش مجازی اور روحانی لحاظ سے نہیں جسمانی اور نسلی لحاظ سے فرزندانِ خدا ہیں؟

۸۔ یوحنّا باب ۸ فقرات ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲۔ یہودیوں سے گفت و شنید کرتے ہوئے یسُوع نے ان سے فرمایا:

"میں جانتا ہوں کہ تم ابرہام کی نسل سے ہو۔ انھوں نے جواب میں اس سے کہا ہمارا باپ تو ابرہام ہے۔ یسُوع نے ان سے کہا۔ اگر تم ابرہام کے فرزند ہوتے تو ابرہام کے کام کرتے۔ انھوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔ یسوع نے ان سے کہا اگر خدا تمھارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبّت رکھتے۔"

غور فرمایئے مسیح علیہ السلام بار بار فرما رہے ہیں کہ جو کسی کے نقشِ قدم پر چلتا ہے وہ اس کا بیٹا ہے۔ آپ تسلیم فرماتے ہیں کہ یہود نسلِ ابراہیم سے ہیں۔ بایں ہمہ فرماتے ہیں اگر وہ اولادِ ابراہیمؑ ہوتے تو ابراہیمؑ جیسے کام کرتے۔ یہاں بھی آپ اولاد ہونے کا اصل مدار اعمال کو ٹھہرا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہمارا باپ خدا ہے۔ مسیحؑ نے انھیں یہ جواب دیا کہ اگر تم خدا کے بیٹے ہوتے تو مجھ سے محبّت رکھتے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کا بیٹا وہی ہے جو مسیحؑ سے محبّت رکھے۔ اس لحاظ سے مسیح سے محبت رکھنے والے کروڑوں افراد خدا کی اولاد ہیں۔

۹۔ آگے چل کر مسیحؑ اِن سے کہتے ہیں:

"تم اپنے باپ ابلیس سے ہو۔ اور اپنے باپ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہو۔" (فقرہ نمبر ۴۴، باب ۸)

ظاہر ہے کہ وہ نسلی اعتبار سے فرزندانِ ابلیس نہیں تھے انھیں آپ نے بدکرداری کی وجہ سے فرزندانِ ابلیس قرار دیا۔ مزید برآں آپ نے ارشاد فرمایا:

"جو خدا سے ہوتا ہے وہ خدا کی باتیں سنتا ہے۔ تم اس لیے نہیں سنتے کہ خدا سے نہیں ہو۔"

کیا اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ جو شخص گرجے میں مسیحؑ کی باتیں سنتا ہے، وہ خدا سے ہے، فرزندِ خدا ہے۔ اس لحاظ سے یوحنّا، مرقس، لوقا، اور متی تو سب سے بڑھ کر خدا کے بیٹے ہوں گے۔ کیونکہ انھوں نے اناجیل کو قلم بند کیا اور ان کی وجہ سے عیسائی خدا کی باتیں سننے کے قابل ہوئے۔

مختصر یہ کہ انجیل میں باپ اور بیٹا کے الفاظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور "ابن اللہ" سے مراد اصل میں اللہ کا نیک بندہ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انجیل نگاروں نے یہ انداز توریت کے تتبّع میں اختیار کیا ہے۔ جس میں اسرائیل کے لیے خدا کے پہلوٹھے

بیٹے جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ (کتاب خروج باب ۴۔ فقرہ ۲۲،۲۳)
اور خداوند کو بنی اسرائیل کا باپ ٹھہرایا گیا ہے۔ (کتاب یرمیاہ باب ۳۱)
پہلوٹھا ہونے کا یہی اعزاز توریت نے افرائیم کو بھی عطا کیا ہے۔
(کتاب یرمیاہ، باب ۳۱) ظاہر ہے کہ یہ سب مجازات ہیں۔ انجیل نگاروں
نے بھی اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے باپ بیٹے کے الفاظ استعمال
کیے ہوں گے۔ ستم یہ ہوا کہ ان لفظوں کے چکر میں اُلجھ کر ہمارے
عیسائی دوست کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

ہم نے قرآن اور انجیل دونوں سے ولادتِ مسیح علیہ السّلام کے مختصر احوال قلم بند
کر دیئے۔ اب قارئین خود انصاف فرمالیں کہ کس کا بیان دل کو لگتا اور عقلِ سلیم کو اپیل کرتا
ہے۔ ہم نے تاریخ سے استشہاد کرتے ہوئے بن باپ کے بچّوں کی ایک فہرست بھی
پیش کر دی جنھیں یونانی دہم پرستوں نے خدا کا بیٹا ٹھہرایا اور جن کی تقلید میں
عیسائیوں کو خدا کا ایک نیا بیٹا تراشنے کا شوق چرایا۔ صرف ایک کمی رہ گئی۔ انجیل سے
ہم مسیح علیہ السلام کے علاوہ کسی دوسرے بِن باپ کے بچّے کا ثبوت نہیں دے سکے۔ آیئے
اب اس بحث کے اختتام پر یہ کمی بھی پوری کرتے چلیں۔ بن باپ ہی کا نہیں، بن ماں اور
بن باپ کا بچّہ۔ حضرت آدمؑ کے علاوہ ایک دوسری شخصیت۔ آپ عیسائیوں سے پوچھ
دیکھیں۔ وہ انھیں حضرت یسوع مسیح سے مشابہ تو ضرور قرار دیں گے۔ مگر انھیں خدا کا بیٹا
نہیں مانیں گے۔ عجیب منطق ہے حضرت عیسٰی علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہو جائیں تو
خدا کے بیٹے اور دوسرے ماں اور باپ کے بغیر بھی پیدا ہو جائیں تو وہی انسان کے
انسان۔ انجیل کا حوالہ یہ ہے۔

جناب پولوس عبرانیوں کے نام اپنے خط میں (باب ۷) ایک برگزیدہ شخص ملک
صدق سالم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ملک صدق سالم اوّل تو اپنے نام کے معنی کے موافق راست بازی کا بادشاہ ہے۔ پھر سالم یعنی صلح کا بادشاہ۔ یہ بے باپ، بے ماں، بے نسب نامہ ہے۔ نہ اس کی عمر کا شروع، نہ زندگی کا آخر۔ بلکہ خدا کے بیٹے کے مشابہ ٹھہرا۔ پس غور کرو۔ یہ کیسا بزرگ تھا؟"

باب 3

حضرت مسیحؑ کی تعلیمات

جب حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوّت سے سرفراز فرمایا تھا تو بنی اسرائیل کی اخلاقی اور دینی حالت سخت ناگفتہ بہ تھی۔ شرک ان کے اندر رواج پا چکا تھا۔ حضرتِ عُزیر علیہ السلام کو وہ ابن اللہ کہتے تھے۔ جھوٹ، نفاق اور دغل و فصل کی ہر قسم ان کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی۔ ان کے عُلما درہم و دام کے غلام تھے۔ دین کے نام پر دکانداری عام تھی۔ حلال کو حرام، حرام کو حلال کر دینا اِن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے صالحین کو قتل تک کر دینے سے باز نہیں آتے تھے۔ یہ حالات تھے جب اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کیا تعلیمات لے کر آئے تھے؟ قرآنِ حکیم کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لیے اس کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اہلِ اسلام کا ایمان یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر فخر المرسلین حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سبھی انبیاءؑ نے ایک ہی دینِ حق کی تبلیغ کی۔ حالات و ظروف اور ضروریات کے اختلاف کی وجہ سے ان کی شریعتیں الگ الگ ضرور تھیں مگر بنیادی پیغام سب کا ایک ہی تھا کہ اے لوگو! ایک خدا کی عبادت کرو۔ ہماری پیروی کرو تاکہ قیامت کے دن تمھیں شرمندگی اور خجالت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ یہی وہ پیغام تھا جو حضرت مسیحؑ نے اپنے زمانے کے لوگوں میں عام کیا۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ
لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

وَاَطِيْعُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

(زخرف)

"اور جب عیسیٰ واضح دلائل لے کر آئے تو کہا، بلاشبہ تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، اور اس لیے آیا ہوں تاکہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں جن کے متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمھارا پروردگار ہے۔ سو اس کی عبادت کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔"

بائبل اگرچہ موجودہ حالت میں چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ لیکن آج اس بُری بھلی صورت میں بھی وہ قرآنِ حکیم کے اس مضمون کی حرف بحرف شہادت دے رہی ہے۔

آیئے! اس دعوے کی صداقت معلوم کرنے کے لیے ہم کتابِ مقدس کے چند حوالوں کا مطالعہ کریں۔ سب سے پہلے توحید اور ایمان باللہ کا بیان ملاحظہ ہو:

توحید

"سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبّت رکھ۔" (استثناء باب ۶، فقرہ جات ۴، ۵)

"دیکھ آسمان اور آسمانوں کا آسمان، اور زمین اور جو کچھ زمین پر ہے، یہ سب خداوند تیرے خدا ہی کا ہے۔"

اور حزقیاہ نے خداوند کے حضور یوں دُعا کی، اے خداوند! اسرائیل کے خدا کروبیوں کے اوپر بیٹھنے والے، تو اکیلا زمین کی سب سلطنتوں کا خدا ہے۔ تو ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔" (سلاطین)

"وہی اکیلا خداوند ہے۔ تو نے آسمان اور آسمانوں کے آسمان اور اس کے سارے لشکر کو اور زمین کو اور جو کچھ اس پر ہے اور سمندر کو اور جو کچھ ان میں ہے بنایا اور تو سبھوں کا پروردگار ہے۔ اور آسمان کا لشکر تجھے سجدہ کرتا ہے۔" (نحمیاہ)

"یارب! معبودوں میں تجھ سا کوئی نہیں۔"

اور تیری صنعتیں بے مثال ہیں۔

یارب! سب قومیں جن کو تو نے بنایا، آکر تیرے حضور سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی تمجید کریں گی۔

کیونکہ تو بزرگ ہے اور عجیب و غریب کام کرتا ہے۔ تو ہی واحد خدا ہے۔" (زبور، باب ۸۶-۸-۱۰)

"کیونکہ خداوند خدائے عظیم ہے اور سب الٰہوں پر شاہِ عظیم ہے۔" (زبور)

"خداوند اسرائیل کا بادشاہ اور اس کا فدیہ دینے والا ربُّ الافواج یوں فرماتا ہے، میں ہی اوّل اور میں ہی آخر ہوں۔ اور میرے سوا کوئی خدا نہیں۔"

"اور فقیہوں میں سے ایک نے ان کو بحث کرتے سن کر جان لیا کہ اس کو خوب جواب دیا ہے۔ وہ پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اوّل کون سا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے، اے اسرائیل! سُن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اپنی ساری جان اور ساری عقل اور ساری طاقت سے محبت رکھ۔ دوسرا یہ کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں۔ فقیہہ نے اس سے کہا، اے استاد! بہت خوب، تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی اور نہیں۔"
(مرقس، باب ۱۲، فقرات ۲۸ تا ۳۲)

"اے خداوند! قادرِ مطلق! تیرے کام بڑے اور عجیب ہیں۔ اے ازلی بادشاہ تیری راہیں راست اور درست ہیں۔ اے خداوند کون تجھ سے نہ ڈریگا اور کون تیرے نام کی تمجید نہ کرے گا
کیونکہ صرف تو ہی قدّوس ہے اور سب قومیں آکر تیرے سامنے سجدہ کریں گی۔ کیونکہ تیرے انصاف کے کام ظاہر ہو گئے۔"

(مکاشفہ باب ۱۵، فقرات ۳، ۴)

یومِ آخرت پر ایمان

قرآن حکیم جس دن کو "یوم الدین" کہہ کر پکارتا ہے، وہی یہاں انصاف کا دن کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے۔

"تو تم تلوار سے ڈرو
کیونکہ قہر تلوار کی سزاؤں کو لاتا ہے
تاکہ تم جان لو کہ انصاف ہو گا۔"

(ایوّب ۱۹ : ۲۹)

"لیکن خداوند ابد تک تخت نشین ہے
اس نے انصاف کے لیے اپنا تخت تیار کیا ہے
اور وہی صداقت سے جہان کی عدالت کرے گا
وہ راستی سے قوموں کا انصاف کرے گا۔"

(زبور ۹ : ۷، ۸)

"صادق انتقام کو دیکھ کر خوش ہو گا
وہ شریر کے خون سے اپنے پاؤں تر کرے گا

تب لوگ کہیں گے یقیناً صادق کے لیے اجر ہے
بے شک خدا ہے جو زمین پر عدالت کرتا ہے "۔

(زبور ۵۸: ۱۰، ۱۱)

"اور اپنی جوانی کے دنوں میں اپنے خالق کو یاد کر و جب کہ بُرے دن ہنوز نہیں آئے اور وہ برس نزدیک نہیں ہوئے جن میں تو کہے گا کہ ان سے مجھے کوئی خوشی نہیں۔ جبکہ ہنوز سورج اور روشنی اور چاند اور ستارے تاریک نہیں ہوئے۔ اور بادل بارش کے بعد پھر جمع نہیں ہوئے۔

(واعظ ۱۲: ۱، ۲)

"اب سب کچھ سنایا گیا۔ حاصلِ کلام یہ ہے، خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرضِ کلی یہی ہے۔ کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بُری، عدالت کرے گا"۔

(واعظ ۱۲: ۱۳، ۱۴)

"راست بازوں کی بابت کہو کہ بھلا ہو گا۔ کیونکہ وہ اپنے کاموں کا پھل کھائے گا۔ شریروں پر واویلا! کہ ان کو بدی پیش آئے گی۔ کیونکہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا پائیں گے "۔

"اور اس وقت میکائیل مقرب فرشتہ جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لیے کھڑا ہے، اٹھے گا اور وہ ایسی تکلیف کا وقت ہو گا کہ ابتدائی اقوام سے اس وقت تک کبھی نہ ہوا ہو گا۔ اور اس وقت تیرے لوگوں میں سے ہر ایک کا نام کتاب میں لکھا ہو گا، رہائی پائے گا اور جو خاک میں سو رہے ہیں، ان میں سے بہتیرے، جاگ اٹھیں گے بعض حیات ابدی کے لیے اور بعض رسوائی اور ذلتِ ابدی کے لیے اور اہلِ دانش نورِ فلک

کی مانند چمکیں گے اور جن کی کوشش سے بہتیرے صادق ہو گئے ستاروں کی مانند ابدُالآباد تک روشن ہوں گے۔"

(دانی ایل ب ۱۲، فقرہ جات ۱ تا ۳)

اور میں عدالت کے لیے تمہارے نزدیک آؤں گا اور جادوگروں اور بدکاروں اور جھوٹی قسم کھانے والوں کے خلاف اور ان کے خلاف بھی جو مزدوروں کو مزدوری نہیں دیتے اور بیواؤں اور یتیموں پر ستم کرتے ہیں اور مسافروں کی حق تلفی کرتے ہیں اور مجھ سے نہیں ڈرتے مستعد گواہ ہوں گا۔ ربّ الافواج فرماتا ہے۔

(ملاکی ۳ : ۵)

"پس ہم میں سے ہر ایک خدا کو اپنا حساب دے گا۔"

(رومیوں ۱۴ : ۱۰، ۱۲)

ہر وہ شخص جس کی آنکھوں پر تعصّب کی عینک نہ ہو، صاف دیکھ سکتا ہے کہ حضرت مسیحؑ اور دوسرے انبیاؑ کے پیش کردہ بنیادی عقائد (بائبل نگاروں کی نوازش سے غیر واضح اور مبہم انداز میں ہی سہی) اسلام کے اساسی نظریات سے کتنی حیرت انگیز مطابقت رکھتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دونوں ایک ہی ساز سے پھوٹنے والے دو نغمے ہوں اور ایک ہی مصوّر کے ہاتھ کی بنائی ہوئی دو تصویریں ہوں قرآن حکیم نے کتنی سچی بات ارشاد فرمائی ہے کہ: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً

لوگ ایک ہی امّت تھے

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ

اختلاف تو ان میں واضح احکام و دلائل کے باوجود باہمی ضد اور عداوت سے پیدا ہوا۔

کچھ ممانعات

زنا

"تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کر۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ پس اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے۔ کیونکہ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ جائے۔ (متی)

دولت رکھنے کی ممانعت

"یسوع نے یہ سن کر اس سے کہا، ابھی تک تجھ میں ایک بات کی کمی ہے اپنا سب کچھ بیچ کر غریبوں کو بانٹ دے۔ تجھ کو آسمان پر خزانہ ملے گا۔ اور آ کر میرے پیچھے ہو لے۔ یہ سن کر وہ بہت غمگین ہوا۔ کیونکہ بڑا دولت مند تھا۔ یسُوع نے اسے دیکھ کر کہا کہ دولت مندوں کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیسا مشکل ہے۔ کیونکہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔"

(لوقا، باب ۱۸)

ناچ کے بارے میں

شائستگی سے چلیں نہ کہ ناچ رنگ اور نشہ بازی سے نہ زنا کاری اور شہوت

پرستی سے اور نہ جھگڑے اور حسد سے۔"

(پولس رسول کا خط رومیوں کے نام، باب ۱۳)

گوشت اور شراب

یہی اچھا ہے کہ تو نہ گوشت کھائے نہ مَے پیے نہ اور کچھ ایسا کرے جس کے سبب سے تیرا بھائی ٹھوکر کھائے۔

"لیکن میں نے تم کو لکھا تھا درحقیقت یہ کہ اگر کوئی بھائی کہلا کر حرام کار یا لالچی یا بُت پرست یا گالی دینے والے یا شرابی یا ظالم ہو تو اس سے صُحبت نہ رکھو بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ بدکار خدا کی بادشاہت کے وارث نہ ہوں گے؟ فریب نہ کھاؤ نہ حرام کار خدا کی بادشاہت کے وارث ہوں گے نہ بت پرست نہ زناکار، نہ عیّاش، نہ لونڈے باز، نہ چور، نہ لالچی، نہ شرابی، نہ گالیاں بکنے والے، نہ ظالم۔" (پولس رسول کا خط رومیوں کے نام)

عورتوں کے متعلق احکام

اگر عورت اوڑھنی نہ اوڑھے تو بال بھی کٹائے۔ اگر عورت کا بال کٹانا یا سر منڈانا شرم کی بات ہے تو اوڑھنی اوڑھے عورت کو چاہیئے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے تم آپ ہی انصاف کرو، کیا عورت کا بے ستر ڈھکے خدا سے دُعا مانگنا مناسب ہے؟ کیا تم کو طبعی طور پر بھی معلوم نہیں کہ اگر مرد لمبے بال رکھے تو اس کی بے حُرمتی ہے اور اگر عورت کے لمبے بال ہوں تو اس کی زینت ہے۔ کیونکہ بال اسے پردے کے لیے دیئے گئے ہیں لیکن

اگر کوئی حجتی نکلے تو یہ جان لے کہ نہ ہمارا ایسا دستور ہے اور نہ خداوند کی کلیسیاؤں کا۔" (کرنتھیوں کے نام پولس آل کا خط)

"عوتیں کلیسیا کے مجمع میں خاموش رہیں۔ کیونکہ انھیں بولنے کا حکم نہیں۔ بلکہ تابع رہیں جیسا توریت میں بھی لکھا ہے۔"

(پیدائش ۳ : ۱۶)

"عورتیں حیادار لباس سے شرم اور پرہیزگاری کے ساتھ اپنے آپ کو سنواریں، نہ بال گوندھنے اور سونے اور موتیوں اور قیمتی پوشاک سے۔ بلکہ نیک کاموں سے جیسا خدا پرستی کا اقرار کرنے والی عورتوں کو مناسب ہے۔ عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سے سیکھنا چاہیے اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے یا مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے۔"

(تیمتھس کے نام خط ۲، ۹، ۱۳)

اقتباسات کے سلسلہ کو طول دینا پیش نظر نہیں۔ انصاف پسند عیسائی انھی چند عبارتوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج ان کے ہاں مسیح علیہ السّلام کے ان ارشادات کو کس بیدردی سے پامال کیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں کس طرح ان کی خلاف ورزی پر فخر کیا جاتا ہے اور کس طرح ان کی طرف سے مسلمان ملکوں کے اندر بھی وہ گندی اور ناپاک معاشرت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو ان احکام کے سراسر خلاف اور برعکس ہے۔

باب 4

مُعجزاتِ مسیحؑ

سُنّت اللہ یہ ہے کہ ہر نبی کو اتمامِ حجّت کے لیے معجزات بھی عطا کیے جاتے ہیں۔ معجزہ اس چیز کو کہتے ہیں جس کو دکھانے سے دوسرے لوگ عاجز ہوں۔ وہ غیر معمولی واقعہ جس کے صدور سے انسانی عقل و ذہن عجز محسوس کرے جو عام رائج حالات و واقعات سے یکسر مختلف ہو، جسے دیکھ کر انسان سمجھ لے کہ یہ محیّر العقول کارنامہ صرف اور صرف تائیدِ خداوندی کے بل پر دکھایا جا سکتا ہے کسی انسانی طاقت کے بس میں نہیں کہ اس کی نظیر پیش کر سکے۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا ذہن جِلا یافتہ، دل منوّر اور عقل رسا ہوتی ہے۔ ان کے لیے پیغمبر کی زندگی ہی سرتا پا معجزہ ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی آواز اور اس کا روئے انور ہی ان کے لیے پیغامِ ایمان ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ ایک یہودی عالم تھے، جب سنا کہ نبی آخر الزماں کی آمد آمد کا غلغلہ ہے تو اور کوئی دلیل طلب نہیں کی بس اتنا کہا کہ مجھے ان کے پاس لے چلو۔ آپؐ حضورؐ کو ایک نظر دیکھا اور پھر بے ساختہ پکار اٹھے کہ خدا کی قسم! یہ چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا نہیں ہو سکتا۔ مولانا روم نے خوب کہا ہے کہ:

در دلِ ہر کس کہ از دانش مزاست
روئے و آوازِ پیمبر معجزاست

مگر یہ سلیم الفطرت لوگ ہر دور میں تھوڑی ہی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی رہی ہے جو دعوائے نبوّت کے ساتھ ساتھ تائید غیبی کے کھلے کھلے نشانات کی طالب تھی۔ اسی اکثریت کو آخری حد تک مطمئن کرنے کے لیے انبیاءؑ کو معجزات عطا فرمائے گئے۔

حضرات انبیاءؑ کے معجزات پر غور کیا جائے تو قاعدہ کلیّہ کے طور پر ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہر نبی اور رسول کو اللہ تعالیٰ نے مقتضیاتِ وقت کے لحاظ سے

معجزے عطا فرماتے بمثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا چرچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا معجزہ عطا کیا جس نے مصر کے تمام جادوگروں کا فن خاک میں ملا دیا اور ان کے لیے موسیٰ کے خدا پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ فصاحت و بلاغت کا زمانہ تھا۔ عرب اپنی زبان دانی پر نازاں تھے۔ یہاں تک کہ وہ دوسری قوموں کو اپنے مقابلے میں عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے حالات کی رعایت سے آپؐ کو قرآنِ حکیم کا عظیم الشان معجزہ عطا کیا کہ جس کی ایک سُورۃ جیسی سورۃ پیش کرنے کی ہمت بڑے بڑے ادیبوں اور خطیبوں کو نہ ہو سکی اور نہ آج ہو سکتی ہے۔ یہ وہ معجزہ ہے جو آج بھی قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ ٹھیک اسی طرح حضرت مسیح علیہ السّلام کے زمانے میں فنِ طب اپنے عروج پر تھا۔ بڑے بڑے اہلِ فن اس سلسلے میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کر رہے تھے اللہ تعالیٰ نے شفائے امراض میں حضرت مسیح علیہ السلام کو وہ کمالِ کلّی عطا کیا جسے دیکھ کر بڑے بڑے اطبّا دنگ ہو کر رہ گئے۔ ان کمالات میں سے ایک کمال احیائے موتیٰ یعنی مُردوں کو زندہ کرنا تھا۔ اور ظاہر ہے یہ ان کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔

معالم التنزیل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار شخصوں کو زندہ کیا تھا۔

۱۔ عاذر، حضرت مسیح علیہ السلام کا دوست جسے تین دن کے بعد قبر میں سے نکالا۔

۲۔ ایک بڑھیا کا بیٹا، جس کا جنازہ لے جا رہے تھے اور لوگوں کے کندھوں سے اتر کر گھر آ گیا۔

۳۔ ایک چونگی محصول لینے والے کی بیٹی، جو ایک دن کی مری ہوئی اپنے گھر میں پڑی تھی۔

۴۔ سالم بن نوح۔

۱۔ ان میں سے پہلے واقعہ کا ذکر صرف انجیل یوحنّا میں ہے۔ وہ اس عورت کا بھائی ہے جس نے مسیحؑ کے قدموں پر قدرتی عطر انڈیل دیا تھا۔ یوحنّا کہتا ہے کہ یہ واقعہ یروشلم سے ایک کوس کے فاصلہ پر ہوا تھا۔ اور اسی وقت مشہور ہو گیا تھا۔ تعجب ہے دوسرے مصنفینِ اناجیل سے یہ واقعہ کیونکر پوشیدہ رہا۔

۲۔ بڑھیا کے بیٹے کا ذکر اناجیل میں مطلق نہیں۔

۳۔ ابنِ عباسؓ کی روایت میں جسے بنت العاص کہا گیا ہے اس کا ذکر لوقا، مرقس نے کیا ہے اور اسے عبادت خانے کے سردار کی بیٹی بتایا ہے۔ انجیل نگار لکھتے ہیں کہ سردار کے گھر سے اطلاع آئی کہ لڑکی مر گئی اور مسیحؑ نے کہا کہ وہ نہیں مری۔ مسیح ان کے گھر گئے، جہاں اور لوگ بھی تھے۔ مسیحؑ نے لڑکی کو دیکھ کر کہا کہ وہ نہیں مری۔ لڑکی کو فرمایا کہ وہ اٹھ بیٹھے تو وہ اٹھ بیٹھی۔

ہم مسلمان حضرت مسیحؑ کے فرمودہ کو صحیح سمجھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ لڑکی مری نہ تھی بلکہ اس پر سکتہ یا ضعف طاری ہو گیا تھا۔ اور مسیحؑ کی برکت سے اس نے شفا پائی۔

۴۔ سام بن نوح کے زندہ کرنے کا قصہ بھی اناجیل میں مذکور نہیں۔

اناجیل کے اس ناکافی اور غیر واضح اِدّعا کے بعد اب قرآنِ حکیم کی ان آیات پر ایک نظر ڈالیے کتنے اُجلے انداز میں قرآن نے مسیحؑ کے معجزات بیان کیے ہیں۔

اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ

(آل عمران ۔ آیت ۴۹)

"اور جب مسیح بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آئے تو انھوں نے کہا میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں) میں تمھارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں ۔ وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے ۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں، اور مُردے کو زندہ کرتا ہوں میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمھارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔"

قرآنِ حکیم تفصیلاً واقعات بیان نہیں فرماتا ۔ اشارے کرتا ہے اس آسمان کے نیچے آج یہی کتاب پاک ہے جس کے ذریعے پہلے انبیاء کے معجزات کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اگر یہ اس باب میں خاموش ہوتی تو توریت و انجیل کے موجودہ نسخوں کے بل پر کتنے انصاف پسند لوگ ان باتوں کے قائل ہوتے قرآن ان معجزات کو علی الاعلان اس لیے بیان کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک حضرت آدمؑ سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سبھی انبیائے کرام ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مبارک کڑیاں ہیں ۔ ان میں سے کسی ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے ۔ وہ سب کو اہلِ اسلام کی آنکھوں کا نور قرار دیتا ہے طبائع سلیم ہوں تو عیسائی احباب تصدیقِ قرآنی کے اس احسانِ عظیم سے رہتی دنیا تک سبکدوش نہیں ہو سکتے ۔

حضرت مسیحؑ کے ان معجزات کے ضمن میں ایک بات اور بھی صاف ہو جائے ۔ عیسائی پادری عام طور پر ان معجزات کو بیان کرنے کے بعد یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ جب حضرت مسیحؑ کو ایسے عظیم الشان معجزات عطا ہوتے (جن کی نظیر نہیں ملتی) تو یہ کہنا کیسے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیحؑ سے افضل تھے ۔

ان کے نزدیک یہ معجزات تو حضرت مسیحؑ کی افضلیت پر دال ہیں ہمارے نزدیک معجزات وغیرہ کی بحث میں انبیائے کرام کا باہمدیگر تقابل کرانا پرلے درجے کی بدذوقی بلکہ کور ذوقی ہے۔ کیا حضرت موسیٰ یا حضرت ابراہیم علیہما السلام کو جو معجزے ملے تھے وہ حضرت مسیحؑ کو بھی عطا ہوتے تھے۔ اگر نہیں اور عیسائی بھی کہیں گے نہیں تو پھر کیا محض اس وجہ سے ہم حضرت مسیحؑ علیہ السلام کے مرتبہ و مقام کو دوسرے انبیاءؑ سے فروتر سمجھنے لگیں؟ پھر یہ بھی نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے معجزات عطا نہ ہوتے ہوں۔ یہ معجزات بلکہ ان سے بھی زیادہ مہتم بالشان معجزات حضورؐ کی تائید میں دکھائے گئے۔ ہاں اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے پادری صاحبان کو تعصّب کی پٹی آنکھوں سے ضرور ہٹانی پڑے گی۔

گذشتہ ایام میں عیسائیوں کے ایک پادری صاحب نے حیدرآباد میں تقریر کرتے ہوئے یہی اعتراض دہرایا تھا۔ ایک صاحب نے اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے مشہور عالم دین مولانا ظفر احمد عثمانی کی خدمت میں خط لکھا۔ اس پر ان کے دارالعلوم میں سے مولانا محمد مالک کاندھلوی نے اس سوال کا جواب قلم بند فرمایا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی طرف سے اس مسئلہ پر از سر نو بحث کرنے کی بجائے انہی کا جواب من وعن نقل کر دیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"حضرت مسیحؑ علیہ السّلام کو نبوّت اور کتاب انجیل ماں کی گود میں نہیں دی گئی البتہ گفتگو بے شک ماں کی گود میں انھوں نے کی ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے تاکہ اس معجزہ سے ان کی والدہ کی عفّت ظاہر ہو جائے کہ یہ بچہ قدرت الٰہی سے بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ماں ہی کی گود میں کتاب و نبوّت دونوں چیزیں شیر خوارگی کی حالت میں دے دی گئیں تو بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر اس وجہ سے فضیلت لازم نہیں آتی۔ عقلی اعتبار سے اس سے بڑھ کر کمال

یہ ہے کہ ایک قوم کسی شخص کو چالیس برس کی طویل مدت تک اس طرح دیکھتی رہے کہ نہ وہ ایک حرف لکھ سکتا ہے، نہ پڑھ سکتا ہے۔ پھر ناگہاں اسی کی زبان سے علوم ہدایت و معارف و حقائق کے سمندر جاری ہو جائیں اور وہ کلام جو دنیا کو اپنے مقابلہ کا اعلان (چیلنج) کرے اور تمام دنیا اس کے مقابلہ سے عاجز رہے، عرب کے فصیح و بلیغ اس جیسی ایک سطر بھی پیش نہ کر سکیں، یقیناً یہ کمال ماں کی گود میں کلام کرنے سے بڑھ کر ہے۔

ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔

لم یتکلم فی المھد الا ثلث مسیح وصبی کان فی زمان جریج وصبی آخر۔

"ماں کی گود میں سوائے تین بچوں کے اور کوئی نہ بولا۔ ایک حضرت عیسیٰ دوسرا وہ بچہ، جو جریج کے زمانہ میں تھا۔ تیسرا ایک اور بچہ"۔

واقعہ کی تفصیل کے لیے صحیح مسلم کی مراجعت کی جائے۔ جریج ایک عابد اور زاہد شخص تھا جو اپنی ماں کی بددعا کی وجہ سے ایک فتنہ میں مبتلا ہوا کہ ایک بدکار عورت اس کے گرجا کے قریب پناہ لینے والے چرواہے سے زنا کر کے حاملہ ہوئی اور ولادت پر یہ کہہ دیا کہ یہ تو جریج سے پیدا ہوا ہے۔ اس نومولود بچہ نے لوگوں کے سامنے گواہی دی کہ میرا باپ تو وہ چرواہا ہے۔

دوسرا ایک اور بچہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا۔ اس کی ماں نے ایک شہسوار کو گزرتے دیکھ کر تمنا کی، اے اللہ! تو میرے بیٹے کو ایسا ہی بنا دے تو اس بچہ نے کہا، اے پروردگار تو مجھ کو ایسا نہ بنا۔ (صحیح مسلم ج ۲، صفحہ ۳۱۳)

تو معلوم ہو گیا کہ ماں کی گود میں بات کرنا عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں۔ یہ چیز تو بعض عام بچوں کے لیے بھی قدرتِ خداوندی نے ظاہر کی ہے۔ پھر یہ حدیث

سے ثابت ہے کہ سیّدنا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس وقت نبوّت دی گئی تھی جب کہ آدم علیہ السلام کا بدن بھی تیار نہ ہوا تھا۔

مادر زاد نابیناؤں کو تندرست اور مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس وجہ سے دیا گیا تھا کہ اس زمانے میں طِبّ بہت عروج پر تھا۔ اور خداوندِ عالم کی یہ سنّت رہی ہے کہ جس زمانہ میں جو چیز سب سے زائد معیارِ ترقی اور عروج پر تھی، اسی نوع کا انبیاءؑ کو معجزہ دیا جاتا تاکہ دنیا یہ دیکھ لے کہ یہ کمال طاقتِ بشریہ سے بالا و برتر اور اس کا ظہور صرف قدرت خداوندی کی طرف سے ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر (جادوگری) کا فن شباب پر تھا تو حضرت موسیٰ کو وہ معجزے دیئے گئے جن کے سامنے بڑے سے بڑا جادوگر عاجز رہے اور اس کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اطاعت کی گردنیں جُھکا دیں۔ اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے سمجھ لیجئے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں فصاحت و بلاغت کا زور تھا تو اس مناسبت سے آپ کو قرآن کا معجزہ دیا گیا جس کی فصاحت و بلاغت و خوبی نے عرب کے مایہ ناز شعراء کو عاجز کر دیا۔ نیز اگر کوئی ایک معجزہ کسی ایک پیغمبر کو دیا گیا اور وہ کسی دوسرے کو نہیں دیا تو یہ بات اس دوسرے پیغمبر کی تنقیص کی دلیل نہیں۔ اگر حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو تختِ سلیمانی نہیں دیا گیا تو یہ حضرتِ موسیٰؑ و عیسیٰؑ میں کوئی نقصان کا باعث نہیں۔ اسی طرح اگر حضرت سلیمان ید بیضا اور عصا کے معجزات سے خالی رہے، وہ بھی ان کی تنقیص کی دلیل نہیں! اور اگر عقل و دانش سے کام لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ درحقیقت قرآن کا معجزہ اس قسم کے تمام معجزات سے بڑھ کر ہے اوّل تو اس لیے کہ قرآن ایک عقلی معجزہ ہے اور مُردوں کو زندہ کرنا یا عصا اور یدِ بیضا وغیرہ معجزاتِ حسیّہ ہیں اور ظاہر ہے کہ حسّی معجزات سے عقلی معجزہ کا درجہ بڑا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تمام حسّی معجزے صرف

انھی انبیاء کے زمانے تک محدود رہے جب تک وہ انبیاء دنیا میں رہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد نہ کسی نے یدِ بیضا کا معجزہ دیکھا اور نہ عصا کا۔ اسی طرح آج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اور قرآن کا معجزہ قیامت تک دُنیا دیکھتی رہے گی اور اس پر ایمان لاتی رہے گی۔ اسی بنا پر آپ کا فرمان ہے کہ خدا کے ہر پیغمبر کو ایسے معجزے دیئے گئے جن پر لوگ ایمان لاتے رہے۔ اور جو چیز مجھ کو دی گئی وہ وحیِ خداوندی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے روز میری امّت کی تعداد زائد ہوگی (صحیح مسلم میں اس مضمون کی حدیث موجود ہے) تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ایسا کامیاب رہا کہ دنیا اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ صرف تیئیس سال کے عرصہ میں پورا عرب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا حجۃ الوداع میں سوا لاکھ صحابہؓ آپؐ کے ساتھ خادم و جاں نثار تھے اور پچیس سال کے عرصہ میں حضورؐ کی وفات کے بعد پرچم اسلام عرب سے لے کر اسپین تک اور ایک طرف سندھ اور سمرقند تک لہرانے لگا۔ جب کہ بائیبل یہ بتلاتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام کے سب معجزات ناکام رہے۔ بارہ حواریوں کے سوا ان پر کوئی ایمان نہ لایا، اور ان بارہ میں ایک حواری ایسا بھی تھا جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو گرفتار کرا کر سُولی پر چڑھوا دیا۔ پھر یہ کہ اس قسم کے معجزات بلکہ اس سے بڑھ کر آپؐ سے ظاہر ہوئے ہیں مثلاً کھانے کا اور سنگریزوں کا تسبیح پڑھنا، پتھروں کا آپؐ کو سلام کرنا، اونٹ کا آپؐ سے گفتگو کرنا، ستونِ حنانہ کا (وہ ستون جو مسجدِ نبوی میں تھا اور اس پر آنحضرتؐ سہارا لے کر خطبہ فرمایا کرتے تھے) رونا، جب کہ آپؐ نے منبر پر پہلا خطبہ دیا، آپؐ کی اُنگلیوں سے پانی کا چشمہ کی طرح جاری ہونا، ایک کھلے میدان میں دو درختوں کا دور سے آکر آپؐ کی قضاء حاجت کے لیے جُڑ

جانا۔ پھر آپؐ کے حکم سے ان کا علیحدہ ہو جانا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ایک درخت کو آواز دینا جو اپنی جگہ سے اُکھڑ کر آپؐ کے سامنے آتا ہے اور تین مرتبہ :۔

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ ۔

کی گواہی دیتا ہے۔ جب کہ ایک شخص نے آپؐ سے پُرزور الفاظ میں یہ مطالبہ کیا کہ آپؐ کی رسالت کی کون گواہی دے سکتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا :

"یہ درخت"! اور اس کو اس طرح بلایا اور اس نے گواہی دی۔

زمانۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھیڑیے کا ایک شخص سے گفتگو کرنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس کو مطلع کرنا۔ معجزۂ معراج کہ ایک رات میں مکّہ سے بیت المقدس اور وہاں سے ساتوں آسمانوں کے اُوپر تشریف لے جانا اور آپؐ کی انگلی کے اشارے سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا۔ یہ تمام واقعات جو قرآن سے اور اسانید صحیحہ سے ثابت ہیں کسی طرح بھی عیسیٰ علیہ السّلام کے معجزات سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہیں۔ کیونکہ یہ تمام باتیں ایسے طور پر واقع ہو رہی ہیں کہ ان کی نوع میں عقلاً اس کی ذرہ برابر بھی صلاحیت نہ تھی۔ مُردوں کے زندہ کرنے کے واقعات میں کوئی منکر یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ جس مردہ کو زندہ کیا تھا وہ درحقیقت مرا ہی نہ تھا بلکہ اس کو سکتہ کی بیماری تھی وہ دور ہو گئی ہو گی۔ لیکن سنگریزوں کی تسبیح، پتھروں کا سلام، انگلیوں سے پانی کے چشمے کا جاری ہونا، ستونِ حنانہ کے رونے، اور

درخت کا اپنی جگہ سے اُکھڑ کر رُوبرُو حاضر ہونے کے بعد گواہی دینے کی عقلاً کیا تاویل ممکن ہے؟ کوئی شخص ان واقعات میں بعید سے بعید احتمال بھی نہیں نکال سکتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ تمام باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے معجزات سے کم تو کیا بلکہ بڑھ کر ہی ہیں۔

باب

رفعِ آسمانی یا صلیب؟

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السّلام کو طرح طرح کے عظیم الشّان معجزات سے نوازا۔ مقصود یہ تھا کہ خلقِ خدا انھیں دیکھ دیکھ کر آپ کے مبعوث من اللہ ہونے کی معتقد ہوتی چلی جائے اور مخالفینِ حق پر حجّت تمام ہو جائے۔ چنانچہ اناجیل کے مندرجات اور روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ مسیحؑ ان معجزات کے ساتھ گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھوم گئے۔ وہ جہاں جاتے روحانی و جسمانی امراض کی شفائے مجسّم بن کر جاتے۔ لوگ فرطِ عقیدت سے دیوانہ وار آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ آپ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا نمبر ماہی گیروں کا ہے۔ انجیل کہتی ہے کہ حضرت مسیحؑ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے کہا "اے مچھلیاں پکڑنے والو! ادھر آؤ۔ میں تمھیں انسانوں کا شکار کرنا سکھا دوں"۔ قرآن اِن لوگوں کو حواری کے لقب سے یاد کرتا ہے جس کے لفظی معنی کپڑا صاف کرنے والے کے ہیں۔ انجیل میں ان کی تعداد بارہ بیان کی گئی ہے۔ متی نے ان کے باقاعدہ نام بھی درج کیے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جملہ انبیائے کرام پر ایمان لانے والے "اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" میں غریب اور نادار لوگ ہی پیش پیش ہیں۔ یہاں بھی یہی نظر آتا ہے کہ چند مفلس مگر مخلص لوگ دل و جان سے آپ پر ایمان لے آئے اور مرتے دم تک انھوں نے اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی نہیں کی۔

یہود اس صورتِ حال کو دیکھ کر دل ہی دل میں جل بھن رہے تھے۔ حضرت مسیح کی روز افزوں مقبولیت ان کے لیے زہر بھرا پیالہ تھی۔ انھوں نے کذب و

افترا، اتہام و دشنام کے سبھی تیر آزمالیے مگر انھیں کامیابی نہ ہوسکی۔ اب ان کے لیے زیادہ صبر کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ قیصرِ رُوم کے مقرر شدہ والی پلاطیس کے پاس پہنچے۔ یہ بھی کتنا المناک منظر ہوگا۔ جب توحید و رسالت پر ایمان لانے کے مُدعی ایک بُت پرست حاکم کے پاس پہنچے ہوں گے کہ صداقت کے عظیم پیامبر کو دار پر کھنچوا سکیں۔ بہرحال ان لوگوں نے پلاطیس کے دربار میں پہنچ کر الٹی سیدھی کہانیاں گھڑ کر اس کے خوب کان بھرے۔

یوحنا اور متی کی رُو سے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:

"پس بہتیرے یہودی جو مریم کے پاس آئے تھے اور جنھوں نے یسوع کا یہ کام دیکھا، اس پر ایمان لائے مگر ان میں سے بعض نے فریسیوں کے پاس جا کر یسوع کے کاموں کی خبر دی۔ پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا، ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے۔ اگر ہم اسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رُومی آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کائفا نام ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا، ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امّت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔ مگر اس نے یہ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ اس سال سردار کاہن ہو کر نبوت کی کہ یسوع اس قوم کے واسطے مرے گا، اور نہ صرف اس قوم کے واسطے بلکہ اس واسطے بھی کہ خدا کے پراگندہ فرزندوں کو جمع کر کے ایک کر دے۔ پس وہ اسی روز سے اسے قتل کرنے کا مشورہ کرنے لگے۔"

"اور سردار کاہن اور سب صدر عدالت والے یسُوع کو مار ڈالنے کے لیے اِس کے خِلاف جھُوٹی گواہی ڈھونڈنے لگے۔ مگر نہ پائی، گو بہت سے جھُوٹے گواہ آئے لیکن آخر کار دو گواہوں نے آکر کہا کہ اِس نے کہا ہے میں خُدا کے مُقدس کو ڈھا سکتا ہوں اور تین دن میں اسے بنا سکتا ہوں۔ اور سردار کاہن نے اِس سے کھڑے ہو کر کہا، تو جواب نہیں دیتا؛ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں مگر یسُوع خاموش ہی رہا۔ سردار کاہن نے اس سے کہا، میں تجھے زندہ خُدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یسُوع نے اس سے کہا تو نے خود کہہ دیا۔ بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابنِ آدم کو قادرِ مُطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔ اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے۔ اب ہم کو گواہوں کی کیا حاجت رہی؛ دیکھو تم نے ابھی یہ کُفر سنا ہے تمھاری کیا رائے ہے؛ اُنھوں نے جواب میں کہا، وہ قتل کے لائق ہے۔ اس پر انھوں نے اِس کے مُنہ پر تھُوکا اور اس کے مُکّے مارے اور بعض نے طمانچے مار کر کہا "اے مسیح ہمیں نبوّت سے بتا کہ تجھے کِس نے مارا؛

"یسُوع حاکم کے سامنے کھڑا تھا۔ اور حاکم نے اس سے یہ پُوچھا کہ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے؛ یسُوع نے اس سے کہا کہ تُو خُود کہتا ہے اور جب سردار، کاہن اور بزرگ اس پر الزام لگا رہے تھے اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر پلاطیس نے اس سے کہا، کیا تو نہیں سنتا، یہ تیرے خلاف کتنی گواہیاں دیتے ہیں۔ اس نے ایک بات کا بھی اسے جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ حاکم نے بہت تعجّب کیا۔ اور حاکم کا دستُور تھا کہ عید پر

لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برّابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پلاطیس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمھاری خاطر چھوڑ دُوں، برّابا کو یا یسُوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انھوں نے اسے حسد سے پکڑوایا ہے اور جب وہ تختِ عدالت پر بیٹھا تھا تو اس کی بیوی نے اسے کہلا بھیجا کہ تو اس راست باز سے کچھ کام نہ رکھ کیونکہ میں نے آج خواب میں اس کے سبب سے بہت دکھ اٹھایا ہے۔ لیکن سردار کاہنوں اور بزرگوں نے لوگوں کو اُبھارا کہ برّابا کو مانگ لیں اور یسُوع کو ہلاک کرائیں۔ حاکم نے ان سے کہا کہ ان دونوں میں سے کس کو چاہتے ہو کہ تمھاری خاطر چھوڑ دُوں؟ انھوں نے کہا برّابا کو۔ پلاطیس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے، کیا کروں؟ سب نے کہا وہ مصلُوب ہو۔ اس نے کہا کیوں، اس نے کیا بُرائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چِلّا چِلّا کر کہنے لگے، وہ مصلوب ہو۔ جب پلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا بلکہ الٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے رُوبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا، میں اس راست باز کے خُون سے بَری ہُوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب میں کہا، اس کا خُون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اور اس پر اس نے برّابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسُوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا کہ مصلُوب ہو۔

"اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسُوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ

CENTRAL URDU LIBRARY
URDU MALL NIMAYATNAGAR.
HYDERABA D-500029

میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھول میں اڑانے لگے کہ
اے یہودیوں کے بادشاہ! آداب! اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا
لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغہ
اس کے سر پر سے اُتار کر پھر اسے اسی کے کپڑے پہناتے اور مصلوب
کرنے کو لے گئے۔

"جب باہر آئے تو انھوں نے شمعون نامی ایک کرینی آدمی کو پاکر
اسے بے گار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اُٹھائے اور اس جگہ جو گلگتا
یعنی کھوپڑی کی جگہ کہلاتی ہے پہنچ کر پت ملی ہوئی مے اسے پینے کو
دی مگر اس نے چکھ کر پینا نہ چاہا اور انھوں نے اسے مصلوب کیا اور
اس کے کپڑے قرعہ ڈال کر بانٹ لیے اور وہاں بیٹھ کر اس کی نگہبانی
کرنے لگے اور اس کا الزام لکھ کر اس کے سر کے اوپر لگا دیا کہ یہ یہودیوں
کا بادشاہ یسوع ہے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو مصلوب ہوئے
ایک داہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن
طعن کرتے اور کہتے تھے، اے مقدس کو ڈھانے والے اور تین دن
میں بنانے والے، اپنے تئیں بچا۔ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے
اُتر آ۔ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کر ٹھٹھے
سے کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا۔ اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ یہ
تو اسرائیل کا بادشاہ ہے۔ اب صلیب پر سے اُتر آئے تو ہم اس پر
ایمان لائیں۔ اس نے خدا پر بھروسہ کیا ہے۔ اگر وہ اسے چاہتا ہے
تو اب اس کو چھڑا لے کیونکہ اس نے کہا تھا، میں خدا کا بیٹا ہوں۔
اسی طرح ڈاکو بھی جو اس کے ساتھ مصلوب ہوتے تھے اس پر لعن طعن

کرتے تھے۔ اور دوپہر سے تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر یسوع نے بڑی آواز سے چلّا کر کہا ایلی ایلی لما شبقتنی اے میرے خدا، اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سُن کر کہا، یہ ایلیاہ کو پکارتا ہے اور فوراً ان میں سے ایک شخص دوڑا اور سپنج لے کر سرکہ میں ڈبویا اور سرکنڈے پر رکھ اسے چُسایا۔ مگر باقیوں نے کہا ٹھہر جاؤ دیکھیں تو ایلیاہ اسے بچانے آتا ہے یا نہیں۔ یسوع نے پھر بڑی آواز سے چلّا کر جان دیدی۔"[1]

ان طویل اقتباسات کے لیے ناظرین ہمیں معاف فرمائیں لیکن توضیحِ مُدعا کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اب آپ مسیحؑ کے مصلوب ہونے کی اس حسرت ناک داستان کو سامنے رکھ کر خود فیصلہ فرمالیں کہ کیا یہ احوال و کوائف ایک برگزیدہ پیغمبر (بلکہ نصاریٰ کے الفاظ میں ابن اللہ) کی شایانِ شان ہو سکتے ہیں؟ کیا بے بسی اور بے کسی کا یہ منظر حضرت مسیح علیہ السّلام کی خدائی ثابت کرتا ہے یا ان کی بے چارگی اور معاذ اللہ حد سے بڑھی ہوئی کمزوری؟ خدا تو قادرِ مطلق ہے قدرت و طاقت کی صفت اس کے لیے غیر منفک ہے۔ وہ کبھی اس سے مجدا نہیں ہو سکتی۔ یہ ناممکن ہے کہ کبھی تو وہ قوی عظیم ہو اور کبھی اتنا عاجز ہو جائے کہ اپنا دفاع تک نہ کر سکے۔ پھر اگر حضرت مسیح خدا تھے تو یہ کیسے ہوا کہ صلیب پر چڑھتے وقت قدرت و طاقت کی صفت ان سے علیحدہ ہو گئی۔ اور وہ چیخے چلّائے پھانسی چڑھنے پر مجبور ہو گئے۔

خُدا کے تصوّر کو بھی ایک طرف رکھیے۔ عام انسانی خوبیوں کے نقطۂ نظر سے

---

[1] متی، باب ۲۷

اس داستان کا جائزہ لے لیجئے۔ دنیا بھر میں اب تک تو اللہ والوں کی پہچان یہی مانی جاتی رہی ہے کہ:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست!

وہ راہِ خداوندی میں موت کو حیاتِ جاوداں سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تو یہ ہوتا ہے کہ:

جو موت آئے رضائے حبیب کی خاطر
وہ موت، موت نہیں، زندگی کا حاصل ہے

جان دے کر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ "جان آفریں" کا حق ادا نہیں ہو سکا۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مگر انجیل اہل اللہ کے متعلق دنیا جہان کے اس مسلّمہ تصوّر کے بالکل برعکس حضرت مسیح کے جذبات کا نقشہ یہ کھینچتی ہے کہ جب وہ مصلوب کیے جا رہے تھے تو انھوں نے بار بار یہ دعا کی کہ یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ یعنی شہادت کی موت مجھے نصیب نہ ہو۔ جب یہ دُعا منظور نہ ہوئی تو وہ چلّاتے ہوئے اپنے رب سے شکوہ و شکایت پر اتر آئے۔ انھوں نے کہا۔ "ایلی ایلی لما سبقتنی"۔ اے خُدا، اے خُدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

ہمارے خیال میں ہر انصاف پسند آدمی اس کہانی کو حضرت مسیح علیہ السّلام کی ذاتِ والاصفات پر ایک اتّہام قرار دے گا۔ کیونکہ اس طرح کا کردار ایک پیغمبر کے لیے تو ایک طرف رہا۔ عام آدمی کے لیے بھی باعثِ عزّت نہیں سمجھا جاتا۔ حضرت مسیح پر کرم فرمانے کے ساتھ ساتھ اناجیل نے حواریانِ مسیحؑ پر جو نوازشات

فرمائی ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ حضرت مسیحؑ پر اوّل تو ایمان ہی کتنے لوگ لائے۔ انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مگر جو ایمان لائے اِن میں سے ایک یہودا کے متعلق انجیل کہتی ہے:

"جب شام ہوئی تو وہ بارہ شاگردوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا تھا۔ اور جب وہ کھا رہے تھے تو اس نے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک مجھے پکڑوائے گا۔ وہ بہت ہی دلگیر ہوئے اور ہر ایک اس سے کہنے لگا، اے خداوند! کیا میں ہوں؟ اس نے جواب میں کہا، جس نے میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالا ہے، وہی مجھے پکڑوائے گا۔ ابنِ آدم تو جیسا اس کے حق میں لکھا ہے جاتا ہی ہے لیکن اس آدمی پر افسوس جس کے وسیلے سے ابنِ آدم پکڑوایا جاتا ہے۔ اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس کے پکڑوانے والے یہودا نے جواب میں کہا اے ربّی! کیا میں ہوں؟ اس نے اس سے کہا، تُو نے خود کہہ دیا۔" (متی باب ۲۵، ۲۰: ۲۶)

یہ تو متی صاحب کا بیان تھا۔ یوحنّا اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہودا میں شیطان سما گیا تھا۔

"یہ باتیں کہہ کر یسُوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوائے گا۔ شاگرد شُبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کے شاگردوں میں سے ایک شخص جس سے یسُوع محبّت کرتا تھا، یسُوع کے سینہ کی طرف جھکا ہوا کھانا کھانے بیٹھا تھا۔ پس شمعون پطرس نے اس سے اشارہ کر کے کہا کہ بتا تو وہ کس کی نسبت کہتا ہے؟ اس نے

0269

اس طرح یسُوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا کہ اے خداوند وہ کون ہے ؟ یسُوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے۔ پھر اس نے نوالہ ڈبویا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہودا کو دے دیا، اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔"

(یوحنا، باب ۱۳، ۲۱ : ۲۷)

عجیب تماشا ہے! پیغمبر کے عطا کردہ نوالہ سے تو دل میں خدا کی معرفت بھر جانی چاہیے تھی۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ بقولِ یوحنّا اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔

اور اب ذرا اس شمعون پطرس کی سیرت کا اندازہ فرمایئے جس سے بقول یوحنّا یسُوع محبت کرتا تھا۔ پیغمبر کا محبوب جھوٹا، منافق اور غدار بلکہ مُنکرِ پیغمبر بھی ہو سکتا ہے۔ انجیل سے پہلی دفعہ معلوم ہُوا۔

اور پطرس باہر صحن میں بیٹھا تھا کہ ایک لونڈی نے اس کے پاس آکر کہا، تُو بھی یسُوع گلیلی کے ساتھ تھا۔ اس نے سب کے سامنے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں نہیں جانتا کہ تُو کیا کہتی ہے اور جب وہ ڈیوڑھی میں چلا گیا تو دُوسری نے اُسے دیکھا اور جو وہاں تھے ان سے کہا، یہ بھی یسُوع ناصری کے ساتھ تھا۔ اُس نے قسم کھا کر پھر انکار کیا کہ مَیں اس آدمی کو نہیں جانتا۔ تھوڑی دیر کے بعد جو وہاں کھڑے تھے اُنھوں نے پطرس کے پاس آکر کہا، بے شک تُو بھی اُنھی میں سے ہے۔ کیونکہ تیری بولی سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس پر وہ لعنت کرنے اور قسم کھانے لگا کہ مَیں اس آدمی کو نہیں جانتا۔"

(متی باب ۲۶، ۶۹ : ۷۵)

آپ سوچتے ہوں گے یہودا اور شمعون پطرس نے انجیل کے نزدیک اس کردار کا مُظاہرہ کیا تو کیا ہُوا، آخر مسیحؑ کے حواری اور بھی تھے اور وہ تو آخر ثابت قدم ہی رہے

ہوں گے۔ مگر ٹھہریے! متی صاحب یہ جھگڑا بھی چکائے دیتے ہیں۔ وُہ فرماتے ہیں کہ عین اس مصیبت کے وقت مسیحؑ کے ایک دو نہیں سبھی حواری سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔

"اس وقت یسُوع نے بھیڑ سے کہا، کیا تم تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مجھے ڈاکو کی طرح پکڑنے نکلے ہو۔ مَیں ہر روز ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا اور تم نے مجھے نہیں پکڑا۔ مگر یہ سب کچھ اس لیے ہُوا ہے کہ نبیوں کے نوشتے پُورے ہوں۔ اس پر سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گیے۔"

(متی ۲۶، ۵۵:۵۶)

یہ ہے انجیل کی بیان کردہ داستانِ مصلوبیّت۔ اس داستان کو نگاہ میں رکھنے کے بعد آپ مختصر الفاظ میں قرآنِ حکیم سے پیش کردہ حقائق کا مطالعہ کیجیے۔

۱۔ وہ سب سے پہلے حواریانِ مسیح پر عیسائیوں کے لگائے ہوئے الزامات کی صفائی پیش کرتا ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ج وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ (آل عمران ۵۲، ۵۳)

"جب عیسیٰ نے محسُوس کیا کہ بنی اسرائیل کُفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا، کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لاتے۔ گواہ رہو کہ ہم مُسلم ہیں۔ مالک! جو فرمان تُو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا ہے اور رسول کی پیروی قبول کی، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔"

قرآن کہتا ہے کہ یہودی حضرت مسیحؑ کو صلیب پر نہیں چڑھا سکے ان پر معاملہ مشتبہ ہوگیا۔ اور انھوں نے مسیحؑ کے دھوکے میں کسی اور شخص کو پھانسی پر چڑھا دیا۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ مِّنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (النساء)

"انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ پھانسی پر چڑھایا بلکہ اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس سلسلے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس حقیقتِ حال کے بارے میں ظن کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انھوں نے مسیحؑ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ انھیں اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا۔ اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔"

یہودی حضرت مسیحؑ علیہ السلام کے بارے میں شبہ میں کس طرح ڈالے گئے؟ قرآن میں اس کی تفصیل موجود نہیں۔ محقق ابنِ کثیر اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سلسلے میں مختلف روایات جمع کر دی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت مسیح کو گرفتار کرنے کے لیے اس مکان کا محاصرہ کر لیا گیا جس میں وہ اپنے شاگردوں سمیت تشریف فرما تھے تو آپ نے اپنے شاگردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ اپنی طرف اٹھا لے گا اور تم میں سے کسی کو میرا ہم شکل بنا دے گا۔ تاکہ یہودی مغالطہ میں مبتلا ہو کر اسے گرفتار کر کے لے جائیں۔ کون ہے جو اس قربانی کے لیے تیار ہے۔ اس پر ایک حواری نے اپنے آپ کو برضا و رغبت اس قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ چنانچہ اسے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کا ہم شکل بنا دیا۔ حضرت مسیح آسمانوں پر اٹھا لیے گئے۔ بعض

روایات کہتی ہیں کہ آپ کے حواریوں میں سے ایک آدمی پہلے ہی آپ کے ساتھ کمال مشابہت رکھتا تھا۔ جب حضرت مسیح اٹھائے گئے تو یہودیوں نے اسے مسیح سمجھ کر صلیب پر لٹکا دیا۔ ہمارے دور کے ایک فاضل مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس سلسلہ میں خوب تحقیق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

" اس پر ہمارے سارے مفسّرین کا اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکا ہوا۔ اور وہ حضرت مسیح کے دھوکے میں کسی اور کو سُولی پر چڑھا گئے لیکن یہ شخص کون تھا اور دھوکے کی صورت کیا ہوئی؟ اس کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیثِ صحیح میں۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کے جزئیات کو ایک ایک کر کے لایا جائے۔ اس وقت کے پس منظر کو سامنے لایا جائے اور جو صورتِ واقعہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال معلوم ہو، اس کو ترجیحی طور پر اختیار کیا جائے۔ پہلی بات اس سلسلے میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لیے اکابرِ یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ اس کے لیے کافی ثابت نہ ہوا بلکہ آپ کی شناخت کے لیے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق و غدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے لیکن امام المفسرین امام رازیؒ اس راز سے بھی واقف ہیں فرماتے ہیں:

وَالناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم بانہٗ کان قلیل المخالطۃ للناس (تفسیر کبیر)

متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتار کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لیے سپاہیوں کی شامل تھی اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لیے انھیں یہوداہ منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔

اور انجیل یوحنّا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یسُوع نے ان سے پھر پُوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسُوع ناصری کو۔ یسُوع نے جواب دیا مَیں تُم سے کہہ چُکا ہُوں کہ مَیں ہی ہُوں۔" حضرت عیسیٰ کا تعظیمی تخیل تو بعد کی پیداوار ہے معاصر مخالفین و مُعاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسُوع ناصری نامی ایک بدنام و غیر معرُوف مجرم کی تھی وہ سامنے موجُود تھا اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آتے تھے اُسی کی تلاش میں دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرت کو بالفاظِ یہُود، یسُوع ناصری کو تبدیلِ ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں حضرت کی اِسی قدُرت کو بطورِ معجزہ کے بیان کیا گیا ہے۔

چھ دِن کے بعد یسُوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنّا کو ہمراہ لیا اور اُنھیں ایک اُونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور ان کے سامنے اس کی صُورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سُورج کی مانند چمکا۔ (متی ۱۷، ۱:۲)

جب وہ دُعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہُوا کہ اس کے چہرہ کی صُورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہوگئی۔ (لوقا ۹: ۲۹ نیز مرقس ۹: ۲)

یہ معجزہ تھا یا نہ تھا۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہرحال آپ کو نفسِ قدُرت اس پر حاصل تھی۔ تیسرے اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کر لیا جائے کہ ملک کی آبادی اس وقت اسرائیلیوں (یہود) کی تھی اور اس برادری کے ایک فرد آپ بھی تھے۔ لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رُومیوں پر مشتمل تھی اور یہ رُومی نہ صرف مُشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے مُختلف تھے، بلکہ صُورت، شکل، وضع و لباس زبان و مُعاشرت وغیرہ میں ان سے ایسے ہی الگ تھے جیسے آج انگریز ہندوستانیوں سے مُختلف و مُمتاز ہیں اور جس طرح آج ہندوستانیوں کو سب فوجی گورے یکساں اور گوروں کو سارے کالے ایک سے معلُوم ہوتے ہیں، بدیسی رُومی سپاہیوں اور فوجیوں کی نظر میں سب یہُود یہُود

اور اسرائیلی اسرائیلی بھی ایک ہی تھے۔ چوتھی کڑی اِس سلسلے کی یہ ملا یئے کہ جس مُقام پر رُومی عدالت تھی وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ اور سُولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف (T) ٹی کے مُشابہ یا ریلوے سگنل سے مِلتی جُلتی ہوتی تھی وہ سُولی گھر میں پوری گڑی ہوتی نہیں ہوتی تھی صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑا ہُوا رہتا تھا۔ باقی جو لکڑی اس کے اُوپر آڑی آڑی پڑتی تھی اس کے لیے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اُوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی۔ یہاں تک جو کچھ عرض ہُوا اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے اُمور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آیئے:

۱۔ حُکم جب سنایا گیا ہے جُمعہ کا دن تھا اور دن آخر ہو رہا تھا۔ اور یہُود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پا کر شاموں شام گھر واپس آجائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے ان کا یوم السبت شرُوع ہو جاتا تھا اور یوم السبت کے حدُود کے اندر مُجرم کی سزادہی وغیرہ بھی ممنوع تھی اور پھر یہُود کا اہم تہوار عید فصح بھی شروع ہو رہا تھا۔ غرض یہُود کو اس کی بہت عجلت تھی کہ کسی طرح اِن کا یہ مُجرم جلد سے جلد سُولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

۲۔ لاغر و ناتواں مجرم (یعنی خود حضرت مسیحؑ) کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور شریر قسم کے یہود خود ہی قدم قدم پر انھیں چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے اب اس ساری صُورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیشِ نظر رکھ کر فرمایئے کہ رُومی سپاہی جو مجرم بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سُولی کے لیے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لیے ہوئے تھے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے خود تو اپنے اوپر سُولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ اُنھوں نے وہی کیا جو اُن کی جگہ کوئی بھی اُن جیسا انسان کرتا۔ انھوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اس پر لاد دی۔ انگریز ایسے موقع پر کیا کرتے؟ گارد ایسے موقع پر کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ

لیتا اور اُس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و قرینہ نہیں۔ انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے۔ "اُنھیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا، اسے بے گار پکڑا کہ اس کی صلیب اُٹھائے۔"

(متی ۲۷: ۳۲)

جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ منظم مجمع نہیں بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اس سے تمسخر کرتا ہوا سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا تو رومی پولیس گارد جو ساتھ تھا، اب اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل و دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے۔ وہ اپنے حسبِ دستور مجرم اسی کو سمجھے جس کے اُوپر صلیب لدی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجیے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لیے سب یہودی اجنبی ہی تھے اور اس کے لیے باہم دگر ہم شکل اور یکساں۔ اُنھیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ اُنھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نظر نہیں آسکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا۔ لیکن اُدھر مجمع کا شور و ہنگامہ، ادھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی، اسی افراتفری کے عالم میں اسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا اور وہ چیختا چلّاتا رہا۔ حضرت مسیحؑ قدرتاً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوتے ٹامک ٹوئیے مارتے رہ گئے۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ یہ عقیدہ نوایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم فرقہ باسلیدیہ کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سالِ وفات ۱۳۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا اور کھلم کھلا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ نہیں ہوتے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔"

بہرحال حقیقتِ حال کچھ بھی ہو۔ خواہ حضرت مسیحؑ زیرِ محاصرہ مکان ہی سے آسمانوں

پر اُٹھا لیے گئے ہوں یا اور ان کی جگہ ان کا کوئی حواری قربانی دیتے ہوتے مصلوب ہو گیا ہو یا وہ سُولی گھر کی طرف آتے ہوتے اس طرح یہودیوں کے ہاتھ سے بچا لیے گئے ہوں (اور اُنھیں آسمانوں پر اٹھا لیا گیا ہو) جس طرح مولانا دریا بادی نے بیان کیا ہے اس سے نفسِ مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ حقیقت بہر حال مسلّم ہے کہ یہود حضرت مسیحؑ کو پھانسی نہیں چڑھا سکے۔ وہ خائب و خاسر ہوتے۔ اور مسیح علیہ السلام کامیاب و کامران ہوتے۔

اس موقع پر عموماً پادری صاحبان عامۃ المسلمین کو ایک مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب حضرت مسیحؑ خود اہلِ اسلام کے نزدیک بھی آسمانوں پر موجود ہیں اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر زمین پر تو اس سے حضورؐ پر حضرت مسیحؑ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ مسلمان اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے۔؟

ہمارے نزدیک پادری صاحبان کی یہ دلیل ایک منطقی مغالطے کے سوا کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان سے کوئی عرض کرے کہ بندہ نواز! ہم نے حضرت مسیحؑ کے فضائل کا انکار کب کیا ہے۔ ہم تو انھیں خُدا کا برگزیدہ پیغمبر مانتے ہیں۔ اُن کی شان میں سُوءِ ادب ہمارے عقیدہ میں ایمان کا زیان ہے۔ مگر معاف فرمایئے فضیلت کا یہ معیار جو آپ نے قائم کر رکھا ہے حد درجہ جاہلانہ ہے۔ آپ فرشتوں سے حضرت مسیحؑ کو یقیناً افضل مانتے ہوں گے۔ مگر کیا آپ کو خبر نہیں کہ ان گنت لاتعداد فرشتے اس وقت بھی آسمان پر موجود تھے جب کہ مسیحؑ پیدا بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت بھی آسمان پر تھے جب مسیحؑ زمین پر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور اب بھی آسمانوں کا چپہ چپہ ان کے سجدوں سے آباد ہے تو کیا اس وجہ سے آپ فرشتوں کو حضرت مسیحؑ پر فضیلت دے دیں گے؟ اس مثال کو بھی رہنے دیجیے۔ فضائے آسمانی اور جوا ثیری میں یہ جو رات دن چڑیاں اور کوّے، چرند اور پرند اڑتے رہتے ہیں، درآنحالیکہ انسان زمین پر ہوتا

ہے کیا انسانوں پر چڑیوں اور کوّوں کی فضیلت لازم آتی ہے ؟ آخر یہ مجرّد نیچے یا اُوپر ہونا افضل و مفضُول ہونے کی علامت کب سے بن گیا ؟ ہم بلا تشبیہ عرض کرتے ہیں حاشا و کلاّ اِس سے مقصُود حضرت مسیحؑ علیہ السّلام کی ذاتِ اقدس میں گستاخی کرنا نہیں کیا آپ نے کبھی یہ منظر نہیں دیکھا کہ سطح دریا پر بلبلے بلند ہو رہے ہوتے ہیں۔ مگر دریا کی گہرائیوں اور پستیوں میں گوہر آبدار چمک رہے ہوتے ہیں۔ کیا کوئی عقل مند آدمی محض بُلبُلوں کے بلند ہونے اور اُوپر اٹھنے سے انھیں پستی میں پڑے ہوتے جواہر پر ترجیح دے دے گا ؟

مُمکن ہے پادری صاحبان ہماری ان معروضات پر انھیں الزامی جواب قرار دے کر غور نہ فرمائیں اس لیے ہم بائبل سے اس سلسلے میں اِستناد کریں گے۔ عہدنامہ قدیم میں حضرت ایلیاہ کے متعلق لکھا ہے کہ :

"اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھو ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے ان دونوں کو جُدا کر دیا اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا۔ الیشع یہ دیکھ کر چلّایا۔ اے میرے باپ! میرے باپ! اسرائیل کے رتھ اور اس کے سوار! اور اس نے اسے پھر نہ دیکھا۔ سو اس نے اپنے کپڑوں کو پکڑ کر پھاڑ ڈالا اور دو حصّے کر دیا۔"

(سلاطین ۲ باب ۲ ، ۱۱ : ۱۳)

اس اقتباس سے دو باتیں صراحت کے ساتھ ثابت ہو رہی ہیں۔

۱۔ حضرت ایلیاہ آسمان پر چلے گئے۔

۲۔ وہ رتھ میں سوار ہو کر آسمان پر گئے۔

قارئین کو شاید معلوم نہ ہو یہ ایلیاہ وہ ہیں جن کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک وہ آسمانوں سے نیچے تشریف نہ لے آئیں مسیح کا ظہور نہیں ہو

سکتا۔ چنانچہ جب حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تو انھوں نے آپ سے سوال کیا "کیا آپ مسیح ہیں"؟ اور پھر خود ہی کہا۔ آپ مسیح کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ ایلیاہ ابھی نہیں آیا۔ تو مسیحؑ نے ان کو جواب دیا "ایلیاہ آگیا ہے، وہ یحییٰ ہے"۔ گویا ایلیاہ آسمان پر گئے بھی اور پھر یحییٰ اُن کے مثیل بن کر آسمانوں سے زمین پر بھی تشریف لے آئے اگر صعود و نزول کو وجہِ فضیلت قرار دیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ایلیاہ مسیحؑ سے افضل ہیں کیونکہ وہ مسیح سے پہلے آسمان پر گئے اور رتھ پر سوار ہو کر گئے۔ پھر وہ حضرت یحییٰ کی شکل میں آسمانوں سے دنیا میں تشریف بھی لے آئے اس سلسلے میں اولیّت کا سہرا انھی کے سر ہے وہ عیسائی منطق کی رُو سے حضرت مسیحؑ کیا کُل انبیاءؑ سے افضل ثابت ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا پادری صاحبان ایلیاہ کو حضرت مسیحؑ سے افضل ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر وہ ہم سے یہ مطالبہ کیوں کرتے ہیں کہ محض مسیحؑ کے صعود و نزول سے ہم انھیں نبی آخر الزماں سے افضل قرار دیں؟ ایک ہی چیز اپنے لیے غیر ضروری اور دوسروں کے لیے لازمی بتانے والی چابکدستی تو اسی طرز کی فن کاری ہے جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؎

تمھاری زُلف میں آئی تو حُسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

باب 6

کچھ انجیلوں کے بارے میں

قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

وَقَفَّيْنَا عَلٰى آثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَآتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (المائدہ ۴۶)

"پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا، اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے انجیل کے نام سے ایک آسمانی کتاب عطا کی تھی جس کا ایک ایک لفظ منزل من اللہ تھا۔ لیکن آج بائبل کے نام سے جو کتابِ مقدس پائی جاتی ہے آیا اس کا ایک ایک لفظ منزل من اللہ ہے کہ نہیں؟ اس میں اہلِ اسلام ہی نہیں خود مسیحی محققین بھی متردد ہیں۔ ایک زمانے میں عیسائی فاضل یہ عقیدہ ضرور رکھتے تھے، لیکن علم و سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان پر بائبل کی بوالعجبیاں آشکارا ہوتی گئیں یہاں تک کہ اب وہ اسے لفظاً لفظاً الہامی کتاب ماننے میں سخت متامل ہیں۔ ایک مشہور پادری ولیم میچن لکھتے ہیں:۔

"مسلمان علماء کے نزدیک خدا اپنا کلام بذریعہ وحی نازل کرتا ہے یعنی اس کا

ہر ہر لفظ خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔اس کا دوسرا نام الہام باللفظ ہے۔کیا مسیحیوں کو لازم ہے کہ بائبل کے حق میں ایسا ہی خیال کریں بیشک ایک زمانہ تھا کہ سب مسیحی علماء کا یہ اعتقاد تھا۔لیکن مسیحی کلیسا کے ابتدائی زمانے میں ایسا نہ تھا۔اس وقت یہ خیال تھا کہ کتبِ مقدسہ کے مضامین خدا کے الہام سے لکھے گئے پر جہاں تک معلوم ہو سکتا ہے یہ خیال نہ تھا کہ ہر لفظ روح القدس نے لکھایا[1]"

انسائیکلو پیڈیا ببلیکا میں اناجیل کے متن میں تغیر و تبدل کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ لوگ عہد نامۂ قدیم کو ابتدائی زمانے میں بھی الہامی کتاب نہیں سمجھتے تھے۔

"The NT in very early times had no canonical authority and alterations and additions were actually made where they seemed improvements."

"عہد نامۂ جدید شروع میں کوئی مقدس سند ہونے کا درجہ نہ رکھتا تھا اور اس میں جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت پڑتی تھی وہاں پر تبدیلیاں اور اضافے کر دیے جاتے تھے[2]"

غرض قرآن جس الہامی انجیل کا تذکرہ کرتا ہے وہ آج روئے زمین پر کہیں موجود نہیں۔وہ موجود ہوتی تو ظاہر ہے کہ حضرت مسیح اور ان کے حواریوں کی زبان میں ہوتی اور حضرت مسیح یہودی النسل ہونے کی وجہ سے عبرانی زبان بولتے تھے۔مگر آج جو انجیلیں موجود ہیں وہ سب کی سب یونانی زبان میں ہیں اور یہیں سے دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے کیے گئے ہیں۔بائبل کے لفظی معنی کتاب کے ہیں۔اس کے دو حصے ہیں۔

---

[1] مسیحی مسائل ص ۱۲-۱۴ ، [2] انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۴ ص ۹۸ء۴

پہلا حصّہ عہد نامۂ قدیم یا عہد نامۂ عتیق کہلاتا ہے۔

دوسرا عہد نامۂ جدید۔ (عہد نامۂ قدیم کو تورات کہہ لیجیے اور عہد نامۂ جدید کو انجیل)

یہاں موضوعِ بحث اناجیل ہیں اس لیے ہم عہد نامہ قدیم کو چھوڑ کر عہد نامہ جدید کا تعارف کرائیں گے۔

انجیلیں تعداد میں بے شمار ہیں۔ دوسری صدی عیسوی میں جب عیسائیوں میں فرقہ بندی کا عام چلن ہوا تو ہر فرقے نے اپنی ضروریات کے تحت ایک انجیل تصنیف کر ڈالی جس میں اپنے مسلک کی حقّانیت ثابت کرنے کے لیے حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کے اقوال و افعال کو سند کے طور پر استعمال کیا گیا۔ تاریخ صحفِ سماوی میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے ان انجیلوں کی مندرجہ ذیل فہرست شامل ہے:۔

۱	انجیل طفولیت جو متی نے لکھی	۲	انجیل پطرس
۳	انجیل یوحنّا	۴	انجیل دوم یوحنّا
۵	انجیل اندریاہ	۶	انجیل فلپ
۷	انجیل بارتھالومی	۸	انجیل توما
۹	انجیل اول و دوم، نوشتۂ توما	۱۰	انجیل یعقوب
۱۱	انجیل نیقودیما	۱۲	انجیل متھی گرز
۱۳	انجیل مرقس، مصریوں کی	۱۴	انجیل مرقس مروّجہ
۱۵	انجیل برناباس	۱۶	انجیل لوقا
۱۷	انجیل متی	۱۸	انجیل تھی ڈائس
۱۹	انجیل پال	۲۰	انجیل پسی لیڈس
۲۱	انجیل سر نتھس	۲۲	انجیل ابیانی
۲۳	انجیل یہودیہ	۲۴	انجیل جوڈ

۲۵	انجیل مارشیین	۲۶	انجیل ناصرین
۲۷	انجیل ٹاٹیاں	۲۸	انجیل ولن ٹینس
۲۹	انجیل سٹی تھینس	۳۰	انجیل اپلس
۳۱	انجیل انکارٹیٹس	۳۲	انجیل ولادتِ مریم
۳۳	انجیل جوڈاس	۳۴	انجیل کا ملیٹ

ان اناجیل کے علاوہ یہ فرقے بے شمار خطوط کو بھی مانتے ہیں جو ان کے نزدیک حواریانِ مسیحؑ کے تحریر کردہ ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد ۱۱۲ تک شمار کی گئی ہے۔ آہستہ آہستہ اس فرقہ واریت اور انتشار کو عیسائی قائدین نے شدّت سے محسوس کرنا شروع کیا۔ آخر چوتھی صدی عیسوی کے درمیان مشہور نیقہ کونسل منعقد ہوئی جس میں ان تمام انجیلوں میں سے اتفاق رائے کے ساتھ چار انجیلیں متی، مرقس، لوقا، یوحنا، حواریوں کے اعمال اور پال کے تیرہ خطوط، گویا کُل ۲۷ کتابیں مستند اور معتمد قرار دی گئیں۔ انھی کتابوں کے مجموعے کا نام عہدنامہ جدید ہے جسے پوپ گلاسیوس نے اپنے حکم سے عیسائیوں میں رائج کیا اور آج تک عیسائیوں میں یہی مجموعہ رائج چلا آتا ہے۔

باہمی تضاد

اس کے باوجود اس مجموعہ میں کچھ ایسے تضادات باقی رہ گئے ہیں جن سے کتابِ مقدّس کی عظمت خاصی مجروح ہوتی ہے مثلاً:

۱- سموئیل دوم باب ۸، آیت ۴ میں ہے:

"اور داؤد نے اس کے ایک ہزار سات سو سوار اور بیس پیادے پکڑ لیے"

تواریخ اوّل باب ۱۸، آیت ۴ میں اسی واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"اور داؤد نے اس کے ایک ہزار رتھ اور سات ہزار سوار اور بیس ہزار

پیادے لے لیے۔"

سواروں کی تعداد میں دو چار دس کا اختلاف نہیں پورے پانچ ہزار تین سو سواروں کا فرق ہے۔ فرمایئے کس اطلاع کو صحیح قرار دیا جائے:

۲- یوحنّا میں حضرت مسیحؑ اس شاگرد کا ذکر کرتے ہوئے جو انھیں گرفتار کرائیگا ارشاد فرماتے ہیں:

"جسے میں نوالہ تر کر کے دیتا ہوں۔" (باب ۱۳)

متی اس بات کو یوں فرماتے ہیں:

"جو میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالتا ہے وہ مجھے پکڑوائے گا۔" (باب ۲۶)

مگر لوقا کا کہنا یہ ہے:

"جو مجھے گرفتار کرواتا ہے اس کا ہاتھ میرے ساتھ میز پر ہے۔" (باب ۲۲)

ایک ہی واقعہ ہے۔ مگر تینوں انجیلوں نے اسے مختلف فیہ بنا دیا ہے۔

۳- یوحنّا حضرت مسیحؑ کے وطن کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"پھر ان دو دنوں کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو کر گلیلی کو گیا۔ کیونکہ یسوع نے خود ہی گواہی دی کہ نبی اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا۔"

گویا مسیحؑ کا اصل وطن گلیلی نہ تھا کوئی اور تھا۔ (یہودیہ) مگر وہ اسے چھوڑ کر گلیلی آ گئے۔ اب ذرا متی، مرقس اور لوقا کا بیان سماعت فرمایئے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کا وطن گلیلی تھا۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ کسی نبی کی قدر اس کے اپنے وطن میں نہیں ہوتی۔

(متی باب ۱۳، ۵۴: ۵۸۔ مرقس باب ۶ ۴، لوقا باب ۴، ۲۴)

۴- سلاطین اوّل باب ۴: ۲۶ میں لکھا ہے:

"اور سلیمان کے ہاں اس کے رتھوں کے لیے چالیس ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے۔"

مگر تواریخ دوم باب ۹، آیت ۲۵ میں اسی واقعہ کے متعلق یُوں بیان کیا گیا ہے:

"اور سلیمان کے پاس گھوڑوں اور رتھوں کے لیے چار ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے۔"

یہاں بھی ۳۶ ہزار تھانوں کا فرق ہے۔

۵۔ متی باب ۲۰، آیت ۲۱ میں ہے:

"تب زبدی کے بیٹوں کی ماں اپنے بیٹوں کو لے کے اس کے پاس آئی اور کہا کہ میرے دونوں بیٹے تیری بادشاہت میں ایک تیری داہنی اور دوسرا تیری بائیں طرف بیٹھیں۔"

اس آیت میں ماں اپنے بیٹوں کے متعلق حضرت مسیحؑ سے یہ درخواست کر رہی ہے۔ مگر مرقس صاحب فرماتے ہیں (باب ۱۰، آیت ۳۵) کہ یہ درخواست بیٹوں نے کی تھی

"تب زبدی کے بیٹوں یعقوب اور یوحنا نے اس کے پاس آکے کہا، اے استاد! ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو بخش کہ ہم تیرے جلال میں۔ ہم ایک تیرے دہنے ہاتھ اور دوسرا بائیں ہاتھ بیٹھیں۔"

بقیہ دو انجیل نگاروں نے خیر سے اس واقعہ کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔

۶۔ تاریخ اوّل باب ۲۱: ۱ میں ہے:

"اور شیطان نے اسرائیل کے خلاف اُٹھ کر اُبھارا کہ اسرائیل کا شمار کرے"

یہاں اُبھارنے کے فعل کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مگر سموئیل دوم، باب ۲۴: ۱ میں یہی فعل خداوند کی طرف منسوب ہے:

"اِس کے بعد خداوند کا غصہ اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے داؤد کے دل کو ان کے خلاف یہ کہہ کر اُبھارا کہ جا کر اسرائیل اور یہوداہ کو گن۔"

۷۔ متی ایک جگہ تو حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ ان کی پوشاک اُونٹ

کے بالوں کی تھی اور چمڑے کا کمربند ان کی کمر میں تھا اور ٹڈی اور جنگلی شہد ان کی خوراک تھی (باب ۳) مگر اس کے بعد باب ۱۱ آیت ۱۸ میں اس کا بیان بدل جاتا ہے اور وہ کہتا ہے، حضرت یحییٰ کھاتے پیتے نہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر ایک دیو ہے۔

کچھ غیر معیاری انداز

۱۔ "اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد دو عورتیں ایک ہی ماں کی بیٹیاں تھیں انھوں نے مصر میں بدکاری کی، وہ اپنی جوانی میں بدکار بنیں وہاں ان کی چھاتیاں مسلی گئیں اور وہیں ان کی دوشیزگی کے پستان مسلے گئے۔"

"اس نے جو بدکاری مصر میں کی تھی اُسے ترک نہ کیا۔ کیونکہ اس کی جوانی میں وہ اس سے ہم آغوش ہوتے اور انھوں نے اس کی دوشیزگی کے پستانوں کو مسلا، اور اپنی بدکاری اس پر انڈیل دی۔ اس لیے میں نے اسے اس کے یاروں یعنی اسواروں کے حوالہ کر دیا جن پر وہ مرتی تھی۔"

"پس اہلِ بابل اس کے پاس آکر عشق کے بستر پر چڑھے اور انھوں نے اس سے بدکاری کر کے اسے آلودہ کیا۔ اور وہ ان سے ناپاک ہوئی تو اس کی جان ان سے بیزار ہو گئی۔ تب اس کی بدکاری علانیہ ہوئی اور اس کی برہنگی بے لبستر ہو گئی تب میری جان ان سے بیزار ہوئی جیسی اس کی بہن سے بیزار ہو چکی تھی۔ تو بھی اس نے اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کر کے جب وہ مصر کی سرزمین میں بدکاری کرتی تھی، بدکاری پر بدکاری کی اور پھر وہ اپنے ان یاروں پر مرنے لگی جن کا بدن گدھوں کا سا بدن اور جن کا انزال گھوڑوں کا انزال تھا۔ اس طرح تو نے اپنی جوانی کی شہوت پرستی کو جب کہ تیری جوانی کی چھاتیوں کے سبب سے تیرے پستان مسلتے تھے، پھر یاد کیا۔"

۲۔ غزل الغزلات میں ہے:

"میرا محبوب میرے لیے دستۂ مُر ہے، جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے۔" (۱:۱۳)

"سلیمان بادشاہ نے لبنان کی لکڑیوں سے اپنے لیے ایک پالکی بنوائی۔ اس کے ڈنڈے چاندی کے بنوائے۔ اس کی نشست سونے کی اور گدی ارغوانی بنوائی اور اس کے اندر کا فرش یروشلم کی بیٹیوں نے عشق سے مرصع کیا"

(۳:۹، ۱۰)

"اے محبوبہ! عیش و عشرت کے لیے تو کیسی جانفزا ہے۔ یہ تیری قامت کھجور کی مانند ہے اور تیری چھاتیاں انگور کے گچھے ہیں۔ میں نے کہا، میں اس کھجور پر چڑھوں گا اور اس کی شاخوں کو پکڑوں گا۔ تیری چھاتیاں انگور کے گچھے ہوں اور تیرے سانس کی خوشبو سیب کی سی ہو اور تیرا منہ بہترین شراب کی مانند ہو۔" (۷، ۶، ۹)

"ہماری ایک چھوٹی بہن ہے ابھی اس کی چھاتیاں نہیں اُٹھیں جس روز اس کی بات چلے ہم اپنی بہن کے لیے کیا کریں۔" (۸:۸)

۳۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے، تب داؤد لوٹا تاکہ اپنے گھرانے کو برکت دے اور ساؤل کی بیٹی میکل داؤد کے استقبال کو نکلی اور کہنے لگی کہ اسرائیل کا بادشاہ آج کتنا شاندار معلوم ہوتا تھا۔ جس نے آج کے دن اپنے ملازموں کی لونڈیوں کے سامنے اپنے کو برہنہ کیا جیسے کوئی بانکا بے حیائی سے برہنہ ہو جاتا ہے۔ داؤد نے میکل سے کہا کہ یہ تو خداوند کے حضور تھا۔ جس نے تیرے باپ اور اس کے سارے گھرانے کو چھوڑ کر مجھے پسند کیا۔ تاکہ وہ مجھے خداوند کی قوم اسرائیل کا پیشوا بناتے۔ سو میں خداوند

کے آگے ناچوں گا۔"

(۶:۱۹، ۲۰، ۲۱)

"اور داؤد بادشاہ بڈھا اور کہن سال ہوا، اور وہ اسے کپڑے اڑھاتے پر وہ گرم نہ ہوتا تھا۔ سو اس کے خادموں نے اس سے کہا کہ ہمارے مالک بادشاہ کے لیے ایک جوان کنواری ڈھونڈی جائے جو بادشاہ کے حضور کھڑی رہے اور اس کی خبر گیری کیا کرے اور تیرے پہلو میں لیٹ رہا کرے تاکہ ہمارے مالک بادشاہ کو گرمی پہنچے۔ چنانچہ انھوں نے اسرائیل کی ساری مملکت میں ایک لڑکی تلاش کرتے کرتے شونمیت ابی شاگ کو پایا اور اسے بادشاہ کے پاس لاتے۔" (۱۔ سلاطین ۱: ۱،۴)

۵۔ "اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تم ان کے بیچ نہ جانا اور نہ وہ تمھارے بیچ آئیں کیونکہ وہ ضرور تمھارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کر لیں گی۔ سلیمان انھی کے عشق کا دم بھرنے لگا۔ اور اس کے پاس سات سو شاہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا۔ کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا۔ جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا تھا۔"

(۱۱: ۱ تا ۵)

۶۔ "لوط اپنی دونوں بیٹیوں سمیت اپنے شہر سے نکل کر ایک غار میں رہنے لگا۔ تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد

نہیں ہے جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آوے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلا دیں اور اس سے ہم بستر ہوویں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انھوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی پر اس نے لیٹتے اور اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات میں اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ آؤ آج رات بھی اس کو مے پلا دیں اور تو بھی جا کے اس سے ہم بستر ہو کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی اُٹھ کر اس سے ہم بستر ہوئی اور اس نے اس کے اُٹھتے بیٹھتے وقت اسے نہ پہچانا۔" (پیدائش ۱۹ : ۳۰ تا ۳۵)

متی کے باب ۱۵ میں ہے :

"ایک کنعانی عورت آئی اور کہا کہ اے خداوند! مجھ پر رحم کر میری بیٹی ایک دیو کے غلبہ سے بے حال ہے۔ اس نے جواب میں کہا، میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو دے دیں۔"

قطع نظر اس کے کہ اس اقتباس میں حضرت مسیحؑ کھلے لفظوں میں اپنی محدود بعثت کا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے مبعوث ہوتے ہیں ساری دنیا کے لیے نہیں، غور فرمایئے کہ ان کی طرف سے بنی اسرائیل کے علاوہ دوسروں کے لیے کتوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

حضرت آدمؑ اور حوّا کے قصّے میں بائبل نے سب سے پہلے تو حضرت حوّا کی طرف یہ منسوب کیا ہے کہ انھوں نے حضرت آدمؑ کو گناہ کرنے پر اکسایا (قرآن مجید اس تصور کی مکمل

تردید کرتا ہے) پھر یہ بتاتا ہے کہ حضرت حوّا کو اس جرُم کی پاداش میں سزا یہ سنائی گئی کہ:

"اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بڑھاؤں گا
اور درد سے تو لڑکے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہو گا اور
وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔" (پیدائش ۳ : ۱۶)

جرُم حضرت حوّا کرتی ہیں، مگر یہ سزا قیامت تک کے لیے ہر عورت کو دے دی جاتی ہے کہ وہ بچّہ جنتے وقت دردِ زہ میں مبتلا ہو گی اور سزا بھی اتنی سخت ہے کہ حضرت مسیح کے کفّارہ بن جانے کے باوجود عورت بے چاری اس سزا سے نجات نہیں پا سکی۔

ماں کی تعظیم ہر مذہب کی اوّلین تعلیمات میں شامل ہے۔ بلکہ لامذہب اور دہریے بھی ماں کی تعظیم اپنے اُوپر لازم سمجھتے ہیں۔ بائبل کی تعلیم بھی یہی ہے مگر اس نے اس سلسلے میں حضرت مسیحؑ کا جو اُسوہ بیان کیا ہے وہ قابلِ اعتراض ہے:

متی باب ۱۲، فقرات ۴۶ تا ۵۰ میں ہے:

"جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے
اور اِس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے اِس سے کہا، دیکھ تیری ماں
اور تیرے بھائی کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے خبر
دینے والے کو جواب میں کہا، کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟
اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا، دیکھو میری ماں اور میرے بھائی
یہ ہیں کیونکہ جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور وہی بہن
اور ماں ہے۔"

سوال یہ ہے کہ کیا حضرت مسیحؑ کی والدہ محترمہ نے حضرت مسیحؑ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر کے کسی جُرم کا ارتکاب کیا تھا؟ کیا ان کی ماں اس قابل بھی نہ تھی کہ وہ اس سے بات کرتے؟ کیا حضرت مریمؑ آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والی نہ تھیں کہ ان کے بیٹے نے

ان سے یہ بے نیازی برتی ؟ کیا حضرت مسیحؑ اپنی والدہ کی شان میں "کون ہے میری ماں" جیسے الفاظ استعمال کر سکتے تھے۔

یوحنّا باب ۲ میں ہے:

"تیسرے دن قانائے جلیل میں کسی کا بیاہ ہوا۔ اور یسُوع کی ماں وہاں تھی اور یسُوع اور اس کے شاگردوں کی بھی اس بیاہ میں دعوت تھی اور جب مے گھٹ گئی، یسُوع کی ماں نے اس سے کہا کہ اُن کے پاس مے نہ رہی یسُوع مسیحؑ نے اس سے کہا، اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام۔ میرا وقت ہنوز نہیں آیا۔"

انصاف پسند عیسائی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں، کیا حضرت مسیحؑ اپنی والدہ کو "اے عورت! مجھے تجھ سے کیا کام"، کے فقرے سے مخاطب کر سکتے ہیں؟

باب 7

بائبل اور نبیِ آخرُ الزّماں صلّی اللہ علیہ وسلّم

گزشتہ باب میں ہم نے بائبل کی آسمانی حیثیت پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ زندگی کا سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لیے اِس کتاب پر ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ توریت وہ توریت نہیں اور یہ انجیل وہ انجیل نہیں جس کی تصدیق قرآن کرتا ہے۔ یہ چند مجہول الحال لوگوں کی لکھی ہوئی روایات ہیں جن میں حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کی سیرت اور احوال بیان کیے گئے ہیں۔ اور وہ بھی مسخ شدہ صورت میں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کہیں کہیں اِن کتابوں میں "صداقتِ گم گشتہ" کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ یہ مقامات عموماً وہ ہیں جہاں مصنّفین نے اپنی تاریخ نویسی کے جوہر دکھانے کی بجائے حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کے فرمودات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ پیشِ نظر باب میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح عیسائیوں کے تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود بائبل میں آج بھی نبی آخرالزّماں حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق متعدد پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں۔ ہم اس باب میں بطورِ نمونہ صرف چند پیشگوئیوں کا ذکر کریں گے۔

۱۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام کوہِ طور پر حاضر ہوئے تو خداوند نے آگ اور گھٹا اور ظلمت میں سے بنی اسرائیل کو مخاطب کیا۔ اس پر وہ ہیبت زدہ ہو گئے اور انھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا، "آپ ہی خداوند کی باتیں قریب جا کر سُن لیں۔ اس پر حضرت موسیٰ نے خداوند کی باتیں سُنیں، جن میں سے ایک بات استثنا۔ باب ۱۸، آیات ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۰ میں یُوں مذکور ہے کہ:

"خُداوند خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں

میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں
میں تجھ سا ایک نبی برپا کردوں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا
اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو
کوئی باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سُنے گا، تو میں اس کا حساب
اُس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام
سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا، یا اور معبُودوں کے
نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔"

عیسائی دوستوں کا کہنا ہے کہ یہ پیشگوئی حضورؐ کے بارے میں نہیں بلکہ حضرت مسیحؑ کے بارے میں ہے لیکن انصاف پسند اصحاب بادنیٰ تامّل اس دعوے کے بے بنیاد ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ آیئے مندرجہ بالا علامتوں کی روشنی میں مختصر لفظوں میں نبیؐ موعود کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔

ا۔ اس پیشگوئی میں سب سے پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ آنے والا تیرے بھائیوں میں سے ہوگا۔ یعنی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا۔ یہ نہیں کہا کہ بنی اسرائیل میں سے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ اس علامت کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے نہیں بنی اسرائیل ہی میں سے تھے۔ اسی کتاب کے بابِ اوّل میں اناجیل کے حوالہ سے ہم نے حضرت مسیحؑ کا جو شجرۂ نسب درج کیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔ ان میں حضرت مسیحؑ کو صاف صاف الفاظ میں بنی اسرائیل کا ایک فرد قرار دیا گیا ہے۔ آج بھی عیسائی دنیا کسی طرح اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ یہ علامت صرف حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں پائی جاتی ہے جو بنو اسمٰعیل میں سے تھے اور جو بنو اسحٰق کے بھائی تھے۔

ب۔ دوسری علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ تیری ہی مانند (یعنی حضرت موسیٰ علیہ

السّلام کی مانند ہوگا۔

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوتے۔

۲۔ وہ صاحبِ شریعت نبی تھے۔

۳۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دی۔

۴۔ انھیں حکومت حاصل تھی۔

حضرت مسیحؑ علیہ السّلام ان میں سے کسی بات میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے مماثلت و مشابہت نہیں رکھتے۔

۱۔ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوتے۔

۲۔ وہ صاحب شریعت نبی نہیں تھے۔

بلکہ عیسائیوں کی اصطلاح میں تو انھیں نبی کہنا ہی نہیں چاہیے۔ وہ تو خدا کے بیٹے تھے۔ متی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ شریعتِ موسوی کی تجدید کرنے آتے تھے کوئی مستقل بالذات شریعت لے کر نہیں آتے تھے۔

"یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا، جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔"

(باب ۵، آیات ۱۷ تا ۱۹)

یہی نہیں ان کے شاگرد تو اس بات کے دعویدار ہیں کہ حضرت مسیحؑ ان کی گردن سے شریعت کا طوق ہٹانے کے لیے آئے تھے۔ ان کے الفاظ کتنے "مؤدبانہ اور شریفانہ" ہیں کہ "اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں" بلکہ لکھا ہے کہ جس نے ان پر عمل کیا وہ ان کے سبب سے جیتا رہے گا۔ جو مسیحؑ ہمارے لیے لعنتی بنا۔ اس نے ہمیں مول

لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔
(گلیتوں باب ۳، آیات ۱۲ تا ۱۴)

۳۔ حضرت مسیحؑ نے کسی قوم کو غلامی سے نجات نہیں دلائی۔

۴۔ وہ پیغمبر تھے مگر حکمران نہیں تھے۔

اب دیکھیے حضور نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کتنی مماثلت رکھتے ہیں۔

۱۔ آپؐ قدرت کے عام قانون کے مطابق پیدا ہوئے۔

۲۔ آپؐ صاحبِ شریعت نبی تھے۔

۳۔ آپؐ نے عربوں کو عجمیوں کے غلبہ و استیلا سے نجات دلائی۔

۴۔ آپ پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ حکمران بھی تھے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے متعدد وجوہِ مشابہت ہیں جن کی وجہ سے خود قرآنِ حکیم نے اعلان کیا:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمّل)

"ہم نے تمہاری طرف اس عظیم الشان رسولؐ کو گواہ بنا کر بھیجا جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسُول بھیجا تھا۔"

(ج) تیسری علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا اور جو کچھ اس سے فرماتے گا وہ سب ان سے کہے گا۔ حضرت مسیحؑ کے منہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام ضرور ڈالا ہو گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ آج وہ ہے کہاں؟ کیا یہ اناجیل اللہ کا کلام ہیں جن کی جھلک آپ گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں اور جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو العیاذ باللہ لعنتی تک کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس رسولِ عربیؐ کی یہ صفت ملاحظہ فرمائیے۔

قرآن حکیم نے کتنے واشگاف الفاظ میں کہا ہے۔ سورۃ والنجم میں ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

"اور وہ اپنی ہوائے نفس سے کچھ نہیں کہتے۔ جو کچھ کہتے ہیں خدا کی کی ہوئی وحی سے کہتے ہیں۔"

قرآنِ حکیم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ

"اے رسُول پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر تین مرتبہ مجمع عام میں لوگوں سے استفسار کیا کہ کیا میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا۔ سب نے جواب اثبات میں دیا تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا "اے اللہ گواہ رہیو" (کہ میں نے تیرا دین بتمام کمال لوگوں تک پہنچا دیا) حضور کو یہ شہادت لینے کی ضرورت اسی لیے محسوس ہوئی ہوگی کیونکہ توریت میں آپ کی علامت یہ بیان کی گئی کہ وہ جو کچھ اس سے فرمائے گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اس موقع پر قرآن کریم کی اس آیت نے آپ کے اس دعویٰ پر مُہر تصدیق ثبت کی کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

"میں نے آج کے دن تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کا تم پر اتمام کر دیا۔"

(د) چوتھی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کو اللہ تعالےٰ کا نام لے کر لوگوں سے کہے گا۔ حضرت مسیحؑ نے اللہ کی جو باتیں انجیل میں بیان کی ہیں کیا وہ اللہ کا نام لے کر کی ہیں؟ تمام اناجیل اس کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر نبیٔ آخر الزماں حضورِ

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پیشگوئی کتنی صادق آتی ہے۔ اس کا اندازہ اِس سے لگایئے کہ آپ پر غارِ حرا میں جو پہلی وحی نازل ہوئی اس کے الفاظ ہی یہ تھے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ

"پڑھ اس پروردگار کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا"

علاوہ ازیں قرآنِ حکیم کو دیکھ لیجئے اس کی ہر سُورہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

(ر) پھر فرمایا کہ جو کوئی اس کی بات نہ سُنے گا میں اس کا حساب اس سے لوں گا ظاہر ہے کہ اس سے مراد آخرت کا حساب نہیں کیوں کہ وہ تو ہر آدمی سے ہوگا اور ہر نبی کے نہ ماننے والے سے ہوگا۔ یہاں جو بطور خاص حساب لینے کا ذکر کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نبی کے مخالفین و منکرین دنیا ہی میں خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔ جب ہم اس پہلو سے حضرت مسیح علیہ السّلام کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ: (وہ عیسائیوں کے بقول) بے بسی اور بے کسی کے عالم میں صلیب پر چڑھا دیئے جاتے ہیں اور ان کے "قاتل" کامیاب و بامراد واپس لوٹتے ہیں۔ دُنیا میں اللہ تعالےٰ نے ان کے منکرین سے کوئی حساب نہیں لیا۔ اس کے برعکس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک پر نظر ڈالیے۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ آپ کا ایک ایک دشمن اور مخالف دُنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہا۔ وہ یہود جو مدینہ میں آپ کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے یا قتل ہو گئے یا جلا وطن، اور ابوجہل و ابولہب اور مُشرکین قریش کے دوسرے سرداروں کو نہایت بُرے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

(ز) چھٹی بات یہ کہی گئی کہ اگر وہ نبی کوئی ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا تو وہ قتل کیا جائے۔ اس بات کو ذہن میں رکھنے کے بعد قرآنِ حکیم کی اس آیت پر غور کیجئے کیا یہ آیتِ شریفہ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کی بابت اسی بات کو اپنے انداز میں نہیں دہراتی؟

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ

اور اگر وہ بعض باتیں ہماری طرف غلط منسوب کر دے تو بلاشبہ ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیں اور پھر تم میں سے کوئی بھی اسے ہماری گرفت سے بچا نہیں سکتا۔

۲- اب توریت ہی کی ایک دوسری پیشگوئی ملاحظہ ہو:

"اور مردِ خدا موسیٰؑ نے جو دُعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی، وہ یہ ہے، اور اس نے کہا خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے اُن پر آشکار ہوا۔ اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہُوا۔ دس[1] ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر اس کے لیے آتشی شریعت تھی۔"

(استثناء۔ باب ۳۳: ۲)

اس میں تین عظیم الشان رسُولوں کی بعثت کا اعلان ہے۔ سب سے پہلے حضرت موسیٰ کلیم اللہ جو وادی سینا اور سینا پہاڑ (کوہِ طُور) سے خاص نسبت رکھتے ہیں۔ دوم حضرت مسیحؑ جو شعیر سے آشکار ہوئے۔ شعیر اس پہاڑ کا نام ہے جو شام میں واقع ہے نیز یہ ایک قوم کا بھی نام ہے جو آلِ یعقوب میں سے تھی اور تاریخ میں جس کا نام بنو عاشر مذکور ہے۔ اور تیسرے نبی آخر الزماں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کوہِ فاران پر جلوہ آرا ہوئے۔

---

[1] کتابِ مقدس میں پہلے دس ہزار کے الفاظ تھے مگر جب اہلِ اسلام نے اس تعداد کو حضورؐ کے صحابہ پر منطبق کر کے آپ کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا شروع کیا تو کتابِ مقدس میں یہ الفاظ بدل دیئے گئے۔ اب دس ہزار کی بجائے لاکھوں کے الفاظ ہیں۔

یہ کوہِ فاران کہاں واقع ہے؟ اس سلسلے میں خود بائبل ہی کا بیان ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ فاران کے بیابان میں رہتے تھے۔

اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیرانداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا۔ اور اس کی ماں نے مُلکِ مِصر سے اس کے لیے بیوی لی۔"

دُنیا میں عربوں ہی کو آلِ اسمٰعیل کہا جاتا ہے۔ مکّہ اور مدینہ کے درمیان جو پہاڑ فاران کے نام سے مشہور رہے یہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام رہتے تھے قرآنِ حکیم کے پارہ اوّل میں اس کا ذکر ہے کہ یہیں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت حبقوق نبی کی پیشگوئی سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے، سلاہ، اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور اور زمین اس کی حمد سے معمُور ہو گئی۔ اس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔ اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلتی تھیں۔ اور اس میں اس کی قدرت نہاں تھی۔ وبا اس کے آگے آگے چلتی تھی اور آتشی تیر اس کے قدموں سے نکلتے تھے۔ وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہو گئیں۔"

(حبقوق باب ۳: ۳، ۶)

حبقوق نبی کی اس پیشگوئی میں کوہِ فاران کے ذکر کے بعد ان لفظوں پر غور فرمایئے کہ "زمین اس کی حمد سے معمُور ہو گئی"۔ کیا یہ صاف محمّد کا ترجمہ نہیں؟ جس کی حمد کی گئی اور زمین اس کی حمد سے معمُور ہو گئی وہ اسم بامسمّٰی ذات حضُور کے سوا کس کی ہے؟ پھر کہا کہ اس کی نگاہ نے قوموں کو پراگندہ کر دیا۔ کیا یہ ذات حضرت مسیح کی تھی جو (عیسائیوں کے عقیدہ میں) مصلُوب ہو گئے۔ کیا یہ شخصیت حضرت موسیٰ کی تھی جن کی وفات کے کنعے

عرصہ بعد بنی اسرائیل کو ارضِ مُقدس میں داخلہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ تاریخی حقائق کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیجیئے۔ وہ ذات صرف محمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی جس کی نگاہ نے قوموں کو پراگندہ کر دیا تھا اور جو کوہِ فاران پر جلوہ گر ہوئی۔

دوسری نشانی اس ٹکڑے میں آنے والے کی یہ بیان کی گئی ہے کہ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ احادیث و سِیر کی کتابوں سے ثابت ہے کہ جب فتح مکہ کے وقت آنحضرتؐ مکّہ میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت دس ہزار جانباز آپ کے ساتھ تھے اور آپؐ آتشی شریعت یعنی جہاد وقتال کا ارادہ لے کر مکّہ فتح کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ آپؐ ہی کے متعلق حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تھا:

"میرا محبوب سُرخ و سپید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے۔" (غزل الغزلات)

تیسری پیشگوئی

اسی غزل الغزلات میں جس کا ایک فقرہ ابھی ابھی آپ کی نظر سے گزرا ہے حضرت سلیمانؑ کہتے ہیں:

"میرا محبوب سُرخ وسفید ہے۔ وہ دس ہزار میں مُمتاز ہے۔ اس کا سر خالص سونا ہے۔ اس کی زُلفیں پیچ در پیچ اور کوّے سی کالی ہیں۔ اس کی آنکھیں ان کبوتروں کی مانند ہیں، جو دُودھ میں نہا کر لبِ دریا تمکنت سے بیٹھے ہوں۔ اس کے رُخسار پھولوں کے چمن اور بلسان کی ابھری ہوئی کیاریاں ہیں۔ اس کے ہونٹ سوسن ہیں جن سے رقیق مُر ٹپکتا ہے اس کے ہاتھ زبرجد سے مُرصّع سونے کے حلقے ہیں۔ اس کا پیٹ ہاتھی دانت کا کام ہے جس پر نیلم کے پھول بنے ہوں۔ اس کی ٹانگیں کندن کے

پاؤں پر سنگِ مرمر کے ستون ہیں۔ وہ دیکھنے میں لبنان اور خوبی میں رشکِ سرو ہے۔ اس کا منہ از بس شیریں ہے۔ ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔"

(باب ۵، ۱۰: ۱۶)

اس ٹکڑے سے ذرا پہلے یہ کہا گیا ہے کہ:

"تیرے محبوب کو کسی دوسرے محبوب پر کیا فوقیت ہے۔"

یعنی آنے والا نبی دوسرے تمام انبیاء سے کیسے فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے آگے اس سوال کا جواب مذکور ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام حضورؐ کے حلیہ کو انتہائی عاشقانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی بتاتے ہیں کہ (ایک موقعۂ خاص پر) دس ہزار جاں نثار اس کے جلو میں ہوں گے۔ پھر یہ فرمایا کہ وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ عبرانی زبان میں عشق انگیز کی بجائے "محمدیم" کے الفاظ ہیں اس کا ترجمہ "آل ٹو گید رلوّلی" کہا گیا۔ عبرانی زبان کے علماء کہتے کہ "یم" عبرانی میں احترام و اکرام اور جمع و تعظیم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ بائبل میں خدا کو الوہ کی بجائے الوہیم کہا گیا ہے یا جیسے لعل (بزرگ) کی بجائے لعلیم۔ معلوم ہوا کہ یہاں بھی دراصل لفظِ محمدؐ تھا تعظیم کی وجہ سے اسے محمدیم کر دیا گیا بعد میں عیسائی ترجمہ نگاروں نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔

چوتھی پیشگوئی

یسعیاہ باب ۹، آیات ۶، ۷ میں ہے:

"اس لیے ہمارے لیے ایک لڑکا تولّد ہوا۔ اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا۔ اور سلطنت اس کے کندھے پر ہوگی اور اس کا نام عجیب، مشیر، خدائے قادر، ابدیت کا باپ، سلامتی کا شہزادہ ہوگا۔ اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی وہ داؤد کے تخت اور اس کی مملکت

پر آج سے ابد تک حکمران رہے گا۔ اور عدالت اور صداقت سے اسے قیام بخشے گا۔ ربُ الافواج کی غیوری یہ کرے گی"۔

اس پیشگوئی میں بھی ایک نبیّ منتظر کی اطلاع ہے اور حسبِ معمول عیسائی حضرات نے اسے بھی حضرت مسیحؑ پر زبردستی فٹ کرنے کی کوشش کی ہے مگر انصاف شرط ہے۔ اس پیشگوئی میں جو نام آنے والے کے بیان کیے گئے ہیں کیا ان میں سے ایک نام بھی حضرت مسیحؑ کی خصوصیات میں شمار ہو سکتا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ کہا کہ سلطنت اس کے کندھوں پر ہو گی۔ کیا حضرت مسیح کسی سلطنت کے بانی تھے؟ البتہ حضورؐ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اپنے کندھے پر سلطنت رکھتے تھے۔

اس میں ان کے نام کو عجیب کہا گیا ہے۔ عیسیٰ یا مسیح تو کوئی عجیب نام نہیں۔ عیسیٰ سرخ رنگ والے کو کہتے ہیں۔ مسیح مسح سے ہے اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ ہاں محمدؐ ضرور عجیب ہے جس طرح حضورؐ مجموعۂ خوبی ہیں، اسی طرح صوتی و معنوی اعتبار سے آپ کا نام بھی بے مثال ہے۔ یہ وہ نام ہے جو آپ کے سوا کسی کو نہ ملا (کچھ لوگوں نے بعض روایات کے مطابق اگر اپنے بچوں کا یہ نام رکھا بھی تو اس خواہش میں کہ ممکن ہے ہمارا بچہ کتبِ آسمانی کی پیشگوئیوں کا مصداق بن جاتے) دوسرا نام مشیر ہے یا مشیر خدائے قادر، یہ بھی حضور کا وصفِ امتیازی ہے آپ کو مخاطب کر کے کہا گیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

اور آپ کے ماننے والوں کی صفت یہ بیان کی:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ

"اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے"۔

خود حضورؐ نبی کریم فرماتے ہیں:

لَا خِلَافَةَ اِلَّا بِالْمَشْوَرَۃ

"خلافت نہیں ہے مگر مشورہ سے"

کیا انجیل میں حضرت مسیحؑ کے مشیر ہونے کا بھی کوئی ذکر پایا جاتا ہے؟

ان کا تیسرا نام "ابدیت کا باپ" بتایا۔ یہ حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنھیں خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا گیا۔ اور جن کی شریعت قیامت تک کے لیے ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا

خود حضرت مسیحؑ علیہ السلام اپنے وعظ میں کہتے ہیں:

"میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمھیں دوسرا تسلّی دینے والا بخشے گا کہ ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے گا۔" (یوحنا)

اس نبی موعود کا ایک نام سلامتی کا شہزادہ ٹھہرایا۔ سلامتی کا شہزادہ وہی ہو سکتا ہے جس کے لائے ہوئے دین کا نام ہی سلامتی (اسلام) ہے جس کے پیروکار نماز میں پوری دنیا کے لیے سلامتی کی دعا مانگتے ہیں وَاَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ جس نے ملاقات کے وقت ایک دوسرے پر سلامتی بھیجنے کا طریقہ سکھایا ہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ جس نے اپنے جانی دشمنوں کو بھی یہ کہہ کر سلامتی کا پیغام دیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جس کا قرآن سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْن کی نوید سناتا ہے۔

پھر کہا کہ اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔

حضرت مسیحؑ کو تو سلطنت ہی نہیں ملی، پھر اس کی سلامتی اور اقبال کا کیا سوال؟ حکومت تو حضورؐ کو عطا ہوئی جن کے صحابہؓ نے پوری دنیا کو تابع فرمان کر کے چھوڑا۔

پانچویں پیشگوئی

حضرت مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد آپ کے ایک حواری کو کشف

ہوا۔جس کا ذکر اس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے جو سچّا اور برحق کہلاتا ہے۔اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوتے ہے اور اس کا نام کلامِ خدا کہلاتا ہے اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور مہین کتانی کپڑے پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہیں اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کریگا اور قادرِ مطلق خدا کے سخت عذاب کی مَے کے حوض میں انگور روندے گا اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے، بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند۔" (مکاشفہ باب ۱۹ : ۱۱ تا ۱۶)

اس کشف میں یوحنّا نے جس شخصیت کی زیارت کی اس کی علامتوں پر غور کیا جائے تو وہ سوائے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کی شخصیت نہیں ہو سکتی

۱۔ کہا کہ وہ ایک سوار تھا جو سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ مکاشفہ باب ۶ میں اس سے پہلے یہ تصریح کی گئی ہے "اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس کا سوار کمان لیے ہوتے ہے۔ اسے ایک تاج دیا گیا۔ اور وہ فتح کرتا ہوا نکلا تاکہ اور بھی فتح کرے۔" اس میں سوار کی پہچان یہ بیان کی گئی کہ وہ سفید گھوڑے پر سوار ہے۔(۲) کمان لیے ہوتے ہے۔ (۳) فتح کرتے ہوتے نکلا ہے۔ ان میں سے ایک علامت بھی حضرت مسیحؑ پر پوری نہیں اترتی۔ انجیل میں اس کا کہیں کوئی تذکرہ موجود

نہیں کہ وہ کبھی سفید گھوڑے پر سوار ہوتے ہوں۔ یا انھوں نے کمان ہاتھ میں لی ہو یا کوئی فتح حاصل کی ہو۔ فتح کا کیا سوال ان کے لیے تو لڑائی کی نوبت ہی نہیں آئی اس کے برعکس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے۔

ا کتبِ سیر سے ثابت ہے کہ آپ کی سواری میں بھی "بحر" نامی ایک سفید گھوڑا رہتا تھا۔

ب ۔ آپ کمان ہاتھ میں رکھتے تھے۔ جنگ تو جنگ خطبہ کے وقت بھی کمان آپ کے ہاتھ میں رہتی۔ ارشاد فرمایا:

علیکم بالرّمی

"تم پر (تیر) پھینکنا لازم ہے"

ارشاد فرمایا۔

"ارموا فان اباکم کان رامیا"

"تیر اندازی کیا کرو تمھارے باپ بھی تیر اندازی کیا کرتے تھے"

اس ارشاد میں تمھارے باپ سے مراد حضرت اسمٰعیل ہیں جن کے متعلق خود بائبل کی شہادت ہے کہ "اسمٰعیل فاران کے ملک میں رہے اور تیر انداز بنے"

(پیدائش باب ۲۱ : ۲۱)

ج ۔ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو کثرت سے فتوحات عطا کیں (تاکہ اور بھی فتح کرے) آپؐ کے صحابہؓ نے عرب و عجم ہر طرف اسلام کے پرچم گاڑ دیئے۔

۲ ۔ پھر کہا وہ سچا اور برحق کہلاتا ہے۔ حضورؐ کو آپؐ کے ماننے والوں ہی نے نہیں بدترین مخالفین نے بھی صادق اور امین کے نام سے یاد کیا۔

۳ ۔ "وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے" حضورؐ کے راستی کے ساتھ انصاف کرنے کے کفّار و مشرکین تک قائل تھے۔ اعلانِ نبوّت سے قبل بیت اللہ میں سنگ اسود

نصب کرنے کے مسئلہ پر آپ نے تمام قبائل میں راستی کے ساتھ انصاف کیا اس پر اپنے پرائے سب عش عش کر اٹھے۔ آپ کی احادیث اور قرآن میں اِعْدِلُوْا کا حکم بتکرار موجود ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ لڑائی کرتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے کس سے لڑائی کی؟ کب کی اور کہاں؟ کیا عیسائی احباب اس کی ایک بھی مثال پیش کر سکتے ہیں؟ یہ مجاہد فی سبیلِ اللہ تو محمد رسول اللہؐ ہیں جن کے جہاد پر یورپ میں آج بھی غلط سلط پروپیگنڈے کا ایک طوفان برپا ہے۔

۴۔ کہا کہ اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں۔ آگ کے شعلوں سے آپؐ کے غیر معمولی جلال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آپؐ کا حلیہ لکھنے والوں نے صراحت کی ہے کہ آپؐ کی آنکھوں میں لال لال ڈورے پڑے رہتے تھے۔ آپؐ کے سر پر بہت سے تاج تھے۔ اس میں حضورؐ کے جامع الکمالات ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپؐ کے سر پر خاتمیت کا تاج بھی تھا۔ آپؐ سلطانِ عرب بھی تھے اور درویش بھی، سپہ سالار اور مجاہد بھی، قاضی اور منصف بھی قرآن حکیم نے آپؐ کی نبوّت کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا
وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

"اے نبی! ہم نے تجھے شاہد، مبشر، نذیر اپنے حکم سے داعی الی الحق اور سراجِ مُنیر بنا کر بھیجا ہے۔"

۵۔ پھر کہا کہ اس کا ایک نام لکھا ہے جسے اس کے سوا کسی نے نہ جانا۔ یہ ٹکڑا آپ کے اسمائے مبارک کی معجزاتی معنویت کی طرف مشیر ہے۔ آپؐ کے نام کی عظمت کا ذکر اس سے پہلے ایک پیشگوئی میں گزر بھی چکا۔ قارئین ایک دفعہ پھر اسے دیکھ لیں:

۶۔ خون میں ڈوبے ہوئے لباس سے غزوۂ احد میں آپؐ کے دندانِ مبارک کا شہید

ہونا جسم اقدس میں زرہ کا کھب جانا اور آپ کا خون سے تر بہ تر ہونا مراد ہے سفرِ طائف میں بھی آپ کا پورا جسم لہولہان ہوگیا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے خون کا لباس کب اور کہاں پہنا۔ مسیحیوں کے عقیدہ میں وہ صلیب پر بھی لٹکا دیئے گئے ہوں تب بھی ان کا لباس خون میں نہیں ڈوب سکتا۔

۷۔ پھر کہا کہ اس کا نام کلامِ خدا ہے۔ کیا حضرت مسیحؑ کا نام کلامِ خدا ہو سکتا ہے جن کی طرف منسوب چار اناجیل کی حالت یہ ہے کہ:

(ا) متی کی اصلی انجیل عبرانی زبان میں تھی۔ اسے یونانی زبان میں منتقل کیا گیا۔ مگر یہ تک معلوم نہیں کہ اس کا مترجم کون تھا۔

(ب) مرقس کی انجیل کے بارے میں خود عیسائی دنیا میں اختلاف ہے کہ وہ کب تصنیف ہوئی۔ اغلب خیال یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت مسیح سے اکسٹھ سال بعد لکھی گئی۔ کیا اکسٹھ سال بعد وہ وحی لفظاً لفظاً محفوظ رہ سکی ہوگی جو حضرت مسیح پر نازل کی گئی۔

(ج) لوقا صاحب نے حضرت مسیحؑ کا زمانہ ہی نہیں پایا۔ وہ خود پہلے باب میں کہتے ہیں "چونکہ بہتوں نے اس پر کمر باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انھوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے ان کو ہم تک پہنچایا، اس لیے اے معزز تھیفلس میں نے بھی مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے تیرے لیے ترتیب سے لکھوں"۔

جو کتاب مسیحؑ کے بعد ایک آدمی نے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے ترتیب دی ہو وہ کلامِ خدا کیسے ہو سکتی ہے۔

(د) چوتھی انجیل یوحنا حواری کی طرف منسوب ہے مگر متعدد عیسائی اہلِ علم ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک جناب یوحنا کی طرف اس انجیل کی نسبت سرے سے غلط ہے۔

"الفارق بین المخلوق والخالق" کے مؤلف نے اس ضمن میں بہت سے عیسائی اسکالروں کے حوالہ جات یکجا جمع کر دیئے ہیں۔ یہ صرف قرآن مجید ہے جسے ڈنکے کی چوٹ کلامِ خدا کہا جا سکتا ہے۔ حضورؐ کے زمانے ہی میں اسے لکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ روایات سے ثابت ہے کہ ہر رمضان میں حضورؐ کے سامنے پورے قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی تھی۔ اور سالِ وفات میں آپ کے سامنے پورا قرآن مجید دو مرتبہ پڑھا گیا۔ پھر اسے ہر دور میں لاکھوں سینوں نے اپنے اندر محفوظ رکھا۔ جس کے سارے نسخے دنیا سے ناپید ہو جائیں تب بھی اسے حُفّاظ کی مدد سے شوشہ بہ شوشہ نقل کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ پھر کہا کہ آسمان کی فوجیں اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ آسمان کی فوجوں سے مُراد ملائکۃ اللہ ہیں سفید پوشاکوں سے ان کی نورانیت کی طرف اشارہ ہے۔ جنگِ بدر اور اُحد میں ملائکہ کے نزول کا وعدہ خود قرآن میں مذکور ہے۔ قرآن نے حضورؐ کے بارے میں فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ"

"اور فرشتے بھی اس کی پشت پر ہیں"

۹۔ پھر کہا کہ اس کے مُنہ سے تیز تلوار نکلتی ہے اور وہ لوہے کے عصا سے حکمرانی کرے گا۔ کیا اس میں سے کوئی بات یسوع مسیحؑ کی شخصیت میں پائی جاتی ہے؟ لوہے کے عصا سے حکمرانی تو حضورؐ نے فرمائی جن پر نازل شدہ کلام میں "حدید" کے نزول کا ذکر ہے۔ تیز تلوار تو آپ کے مُنہ سے نکلی جس نے کفّار و مشرکین کا قلع قمع کر کے رکھ دیا اور وَجَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا کا منظر پیش کر دیا۔ آپ ہی کی شمشیرِ خارا شگاف تھی جو قادرِ مطلق خُدا کا غضب بن کر منکرین پر نازل ہوئی۔

۱۰۔ آخری نشانی یہ بتائی کہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند ہو گا۔

یہ وہی ہیں جنھیں قرآن نے خاتم الانبیاءؑ کہا۔ جنھوں نے شبِ اسرا میں تمام انبیاءؑ کی امامت کی اور جن پر رُوحُ الامین کی نامہ بری ختم ہے۔ صلّی اللہ علیہ وسلم۔

چھٹی پیشگوئی

یوحنّا باب ۱۶ : ۷ تا ۱۶ میں ہے:

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راست بازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں۔ اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی رُوحِ حق آئے گا تو تم کو سچّائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لیے کہ مجھ سے ہی حاصل کر کے تمھیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمھیں خبریں دے گا۔"

۱۔ اس پیشگوئی میں آنے والے کا نام رُوحِ حق بتایا گیا ہے۔ اصل میں یہاں لفظ فارقلیط تھا۔ یونانی میں ترجمہ کرتے وقت اسے کلیوطاس بنا دیا گیا۔ بعد میں اسے کلیطاس

لکھا جاتا رہا۔ اُردو میں فارقلیط کو کہیں تسلّی دینے والا اور کہیں رُوحِ حق فرمایا گیا حالانکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فارقلیط کا لفظ دراصل احمدؐ کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ حضورؐ نے تشریف لاکر مسیحؑ کی تکذیب کے سلسلے میں یہود کو مجرم قرار دیا۔ حضرت مسیحؑ کا جلال یوں ظاہر کیا کہ اُنھیں خدا کا برگزیدہ پیغمبر منوایا۔ حضرت مریمؑ کے دامنِ عصمت کو یہود کی تہمتوں سے پاک صاف کیا۔ اور ان پر سے بے بسی کے عالم میں چیختے چلّاتے مصلوبیّت کا الزام دھویا۔

۳۔ وہ سچائی کی راہ دکھائے گا۔ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ

۴۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

۵۔ آئندہ کی خبریں دے گا۔ حضورؐ نے قیامت تک کے مختلف ادوار کے بارے میں جو پیشگوئیاں کی ہیں یہ ٹکڑا انھی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ساتویں پیشگوئی

یوحنّا باب ۱، آیات ۱۹ تا ۲۲ میں ہے:

"اور یوحنّا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا۔ بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ اُنھوں نے اس سے پُوچھا، پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے نزدیک تین نبی آنے والے تھے:

۱۔ ایلیاہ (الیاس) جنھیں ان کے عقیدہ میں دوبارہ آنا تھا۔ (۲) مسیح۔ (۳) اور وہ

نبی یعنی نبی موعود، جس کی بشارت حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام نے دی تھی۔

ہمارے نزدیک اوّل تو ایلیاہ کے دوبارہ آنے کا عقیدہ ہی بے بنیاد تھا۔ لیکن اگر بفرضِ مُحال انھیں دوبارہ آنا بھی تھا تو اس کے مُتعلق حضرت مسیحؑ نے فیصلہ فرما دیا کہ یوحنّا ہی ایلیاہ ہیں "۔ اور چاہو تو مانو یوحنّا ہی ایلیاہ ہیں"

(متی باب ۱۱ : ۱۵)

اِس کے بعد حضرت مسیحؑ اور "وہ نبی" رہ جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخصیّتیں ہیں کیونکہ پہلے یوحنّا سے حضرت مسیحؑ کے بارے میں سوال کیا گیا۔ اُنھوں نے انکار کیا تو پھر پوچھا گیا کہ کیا آپ وہ نبی ہیں۔ حضرت مسیح آ چکے۔ ان کے بعد وہ نبی آنے والے تھے۔ کیا عیسائی بتا سکتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے بعد وہ نبی سوائے محمدؐ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کون ہیں۔؟

آٹھویں پیشگوئی

مرقس کی انجیل میں ہے :

"اور یوحنّا اونٹ کے بالوں کا لباس پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا اور ٹڈیاں اور جنگلی شہد کھاتا تھا۔ اور یہ منادی کرتا تھا کہ میرے بعد وہ شخص آنے والا ہے جو مجھ سے زور آور ہے۔ میں اس لائق نہیں کہ جُھک کر اس کی جوتیوں کا تسمہ کھولوں۔ میں نے تو تم کو پانی سے بپتسمہ دیا۔ مگر وہ تم کو روحُ القدس سے بپتسمہ دے گا"۔

(باب ۱، آیات ۶ تا ۸)

حضرت یوحنّا کے بعد رُوح القدس سے بپتسمہ دینے والا کون تھا؟ اگر کہا جائے کہ حضرت مسیحؑ، تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ حضرت مسیحؑ تو خود فرما چکے ہیں :۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوتے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت مسیحؑ کے بقول اُن کے زمانے تک جتنے لوگ بھی عورتوں سے پیدا ہوتے تھے (اور خود حضرت مسیحؑ بھی مریمؑ نامی ایک برگزیدہ خاتون کے بطن سے پیدا ہوتے تھے) ان سب میں یوحنا سے بڑا کوئی نہ تھا۔ مگر یوحنا کہتے ہیں کہ جو آنے والا ہے میں اس کے جوتوں کا تسمہ کھولنے کے بھی لائق نہیں معلوم ہوا کہ یہ شخصیت حضرت مسیحؑ کے بعد آنے والی تھی اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے۔ کیونکہ رُوحُ القدس سے بپتسمہ دینے والے مسیحؑ نہیں محمدؐ تھے۔ حضرت مسیحؑ نے خود کہا رُوح القدس سے بپتسمہ دینے والا میں نہیں، وہ میرے بعد آئے گا۔

رسولوں کے اعمال باب ۱ میں ہے:

"یروشلم سے باہر نہ جاؤ بلکہ باپ کے اس وعدہ کے پورا ہونے کے منتظر رہو جس کا ذکر تم مجھ سے سُن چکے ہو کیونکہ یوحنا نے تو پانی سے بپتسمہ دیا مگر تم تھوڑے دنوں کے بعد رُوحُ القدس سے بپتسمہ پاؤ گے۔" (آیات ۴، ۵)

نویں پیشگوئی

متی باب ۲۳ : ۳۸، ۳۹ میں ہے:

"دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مُبارک ہے وہ جو خُدا کے نام سے آتا ہے۔"

اس ٹکڑے سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیحؑ اٹھائے جانے والے ہیں اور وہ دوبارہ اس وقت تک نہیں آئیں گے جب تک خداوند کے نام سے آنے والا نہ آجائے اور

لوگ یہ نہ پکار اُٹھیں کہ وہ مبارک ہے (یعنی وہ اس پر ایمان نہ لے آئیں) یہ خداوند کے نام سے آنے والا نبیٔ اُمّی ہے۔ اسی کے ظہور کے بعد جب دنیا اس پر ایمان لا چکے گی تو دوبارہ حضرت مسیحؑ کا نزول ہو گا۔ یہی وہ خداوند کے نام سے آنے والا ہے جس کے متعلق حضرت مسیحؑ نے فرمایا:۔

"میں اس کے بعد تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس جہان کا سردار (یعنی سرورِ عالم) آتا ہے اور مجھ میں اِس کا کچھ نہیں۔"

دسویں پیشگوئی

یوحنا باب ۱۴ : ۲۵ تا ۲۷ میں ہے:

"میں نے یہ باتیں تمھارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی رُوحُ القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائیگا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔"

"وہ میرے نام سے بھیجا جائے گا" مراد یہ ہے کہ میری تصدیق کرتے ہوئے مجھ سے یہود کے الزامات دور کرتے ہوئے آئے گا۔ "سب باتیں سکھلائے گا" مطلب یہ ہے کہ اس کے عہدِ رسالت میں دینِ حق کا اتمام ہو گا۔ اَلیومَ اکملتُ لکُم دِینکُم کا اعلانِ عام اس کے عہد میں کیا جائے گا۔ "جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا" اس سے معلوم ہوا کہ دنیا حضرت مسیحؑ کی باتیں بھول چکی ہو گی۔ لوگ ان کی طرف غلط قصے منسوب کریں گے اور وہ آنے والا ازسرِ نو ان باتوں کی یاد دہانی کرائیگا جو مسیحؑ نے اپنے دَور میں لوگوں کے سامنے بیان کیں۔ اسی آنے والے کے بارے میں یسُوعؑ نے یہ منادی کی تھی:

"توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آگئی ہے۔ (متی باب ۴ : ۱۷)

اس باب میں بائبل کی جملہ پیشگوئیوں کا احاطہ کرنا مقصود نہیں ہم نمونے کے طور پر قارئین کے سامنے چند پیشگوئیاں مع مختصر توضیح پیش کرنا چاہتے تھے۔ جو اصحاب عربی زبان جانتے ہوں وہ اس طرح کی ساری پیشگوئیاں دیکھنے کے لیے امام ابنِ تیمیہؒ کی مشہور کتاب الجوابُ الصحیح حصّہ سوم ملاحظہ فرمائیں۔

افسوس ہے کہ علمائے اسلام کی ان مساعی سے حقیقی فائدہ اٹھانے کی بجائے عیسائیوں نے گھبرا کر متن ہی کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ ہم اسی باب میں "دس ہزار قدوسیوں" کو "لاکھوں قدوسیوں" میں تبدیل کرنے کی ایک سعیٔ نامشکور کا تذکرہ کر چکے ہیں۔

سکوفیلڈ ریفرنس بائبل ۱۹۱۷ء کے انگریزی ترجمہ میں دس ہزار قدوسیوں کے الفاظ موجود ہیں۔ مگر اردو ترجمہ نگاروں نے یہ دیکھ کر کہ فتحِ مکّہ کے وقت یہی تعداد حضورؐ کے صحابہؓ کرامؓ کی تھی اس تعداد کو بیک جنبشِ قلم لاکھوں میں تبدیل کر دیا۔

ان پیشگوئیوں کے ضمن میں انجیل برنابا کا حوالہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ انجیل جس کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں کے لیے پانچویں صدی عیسوی میں گلیسیوس نامی پوپ کے حکم سے ممنوع قرار دیا چکا ہے، سولہویں صدی عیسوی میں لاٹ پادری فرامرنیو کو دستیاب ہوئی انھوں نے اسے پوپ سکٹس آف روما کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔ اس کا مطالعہ کرنے پر لاٹ پادری کو معلوم ہوا کہ اس میں نبی آخرالزّمان صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق متعدد پیشگوئیاں بڑے کھلے لفظوں میں موجود ہیں یہاں تک کہ ان میں حضورؐ کا نام نامی احمدؐ تک مرقوم ہے (اس موقع پر حضرت مسیحؑ کے ان الفاظ کو سامنے رکھیے کہ ——— مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِيْ اِسْمُهٗ اَحْمَدُ) وہ اس انکشاف کے بعد پوپ کے کتب خانہ سے اس کتاب کو نکال لایا اور اس نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ انجیل برنابا کا عربی ترجمہ علّامہ سیّد رشید رضا مرحوم کے قلم سے شائع ہو چکا ہے اور آج بھی یہ نبی آخرالزماں کی بعثت کے حق میں عیسائیوں کے لیے ایک ناقابلِ تردید حجّت ہے۔

باب 8

عقیدۂ تثلیث

حضرت مسیحؑ کے آسمانوں پر اُٹھائے جانے کے بعد ایک لمبے عرصہ تک آپ کے ماننے والوں کو سخت مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مسیحؑ سے منسوب ہونا مجرم ہونے کے مترادف بن گیا۔ آپ پر ایمان لانے والوں کو شہروں کی نسبت بن زیادہ محفوظ معلوم ہونے لگے۔ یہیں سے عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز ہوا۔ گویا یہ حادثہ ایک تاریخی مجبوری کی پیداوار تھا۔ اس تاریخی مجبوری نے عیسائی ذہن اور مزاج کو سخت انتہاپسند بنا دیا۔ اپنے نفس کو بے جا عقوبت واذیت پہنچانا، دنیا کے جائز اور حلال لذائذ سے کنارہ کشی، اعزہ واقربا اور بیوی بچوں کے بوجھ سے چھٹکارا اس مزاج کو خدا رسیدہ ہونے کے لیے ضروری نظر آنے لگا۔ بعد میں حالات نے پلٹا کھایا۔ عیسائیت مقبول ہونی شروع ہوئی تو انتہاپسندی کے یہی جراثیم مسیحؑ سے ان کی عقیدت و محبت میں بھی راہ پانے لگے یہاں تک کہ یار لوگوں نے مسیحؑ کو خدا کا بیٹا بنا کر چھوڑا۔ عیسائی عقائد کے عہد بہ عہد ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں حضرت مسیحؑ کی ذات کے متعلق لوگوں میں سخت اختلاف پائے جاتے تھے جن کی وجہ سے قسطنطین اعظم کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے تمام مکاتیب خیال کے نمائندوں کو اکٹھا کیا اور پولوس رسول (سینٹ پال) کے پیش کردہ نظریات کو حرفِ آخر تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ تواریخ مسیحی کلیسا کے پادری مصنف نے ان اختلافات اور بعد کے اس اتفاق کی روداد یوں بیان کی ہے:

"شہنشاہ کونسٹنٹائن نے اس ارادہ سے کہ کلیسا میں زیادہ جھگڑے نہ پڑیں ہسپانیہ کے شہر کورڈوا کے بشپ ہوسیس کو جو مذہبی معاملات میں شہنشاہ

کا صلاح کار تھا۔ اسکندریہ بھیجا اور الیگزنڈر اور ایریس کے نام خطوط ارسال کیے جن میں تحریر فرمایا کہ یہ جھگڑا صرف لفظی تکرار ہے۔ خُدا کے بھید انسانی سمجھ اور ادراک سے بالا ہیں۔ اس پر تو اسکندریہ میں اور بھی آگ لگ گئی۔ زیادہ فساد مچنے لگا۔ ہوسیس واپس شہنشاہ کے پاس آگیا اور شہنشاہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ چونکہ اہم معاملہ کا فیصلہ ضروری تھا اور بعض اور بھی مشکلات تھیں، لہٰذا شہنشاہ نے کلیسیا کے تمام بشپوں کی ایک کونسل بتھینیا کے شہر نائیسیہ میں ۳۲۵ء کے درمیان منعقد کی۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی کئی کونسلیں ہوئیں مگر وہ اپنے اپنے علاقہ کی ضروریات کے مطابق تھیں، لیکن کونسل کونسل عمیم ہوتی جس کا مُدعا یہ تھا کہ تمام کلیساؤں کے وکیل جمع ہو کر اپنے ایمان اور حقیقی برادری کو ظاہر کریں۔ اس کونسل میں تقریباً پندرہ سو ڈیلیگیٹ اور تین سو سے زائد بشپ فراہم ہوئے جو عموماً مشرقی کلیساؤں سے آئے تھے۔ چونکہ علاوہ مسئلہ ایریس کے اور باتیں بھی قابلِ فیصلہ تھیں اس لیے کونسل تین مہینہ تک قائم رہی۔ افتتاحی خطبہ خود شہنشاہ نے پڑھا۔ اگرچہ مباحثہ میں شہنشاہ شامل رہا مگر معاملہ کونسل کے پریذیڈنٹوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ اس کونسل میں تین پارٹیاں تھیں:

الف :۔ آرتھوڈوئس، جن کی تعداد تیس ایک کے قریب تھی۔ ان کے لیڈر تھے الیگزنڈر، ماسیس، ہوسس اور اتھانیسیس جو الیگزنڈریا کا آرچ ڈیکن تھا

ب :۔ کونسرویٹو، ان کی تعداد تقریباً دو سو تھی۔ ان کا لیڈر قیصریہ کا بشپ یوسی بیس تھا۔ یوں تو یہ لوگ ایرین خیالات سے متفق نہ تھے مگر یہ خیال کرتے تھے کہ کلیسا کو اس سے چنداں نقصان کا اندیشہ نہیں۔ اس لیے ایریس سے چنداں سختی نہ کرنی چاہیے۔

ج :- ایرین جن کا لیڈر ایریس تھا۔ اس کے ساتھ نکومیڈیا کا بشپ یوسی بیس اور بعض مشرقی بشپ تھے جو ایریس کو پسند کرتے تھے۔

بہت مباحثہ کے بعد نکومیڈیا کے بشپ کی لیڈری میں اٹھارہ ایرین نے ایک ایرین عقیدہ کونسل میں پیش کیا اور کونسل سے منظوری کی درخواست کی۔ لیکن اس درخواست پر شور رش مچ گئی اور عقیدہ پھاڑ کر پُرزے پُرزے کر دیا۔ اس پر ایریس کے تمام دوستوں نے ایریس کو چھوڑ دیا اور ایرین ازم نامنظور ہو کر رد کر دیا گیا۔ اس کے بعد قیصریہ کے بشپ یوسی بیس نے عقیدہ پیش کیا جو اس کی کلیسیا میں رائج تھا۔ کونسل نے اس عقیدہ کو ارتھوڈکس ایمانی عقیدہ منظور کیا۔ اس پر اتھاناسیس نے عقیدہ کو زیادہ واضح کرنے کی خاطر ذیل کی تین باتیں شامل کرنے پر زور دیا:

الف :- خدا کا اکلوتا بیٹا بایں تشریح کہ وہ باپ کے جوہر سے ہے۔

ب :- مصنوع نہیں بلکہ مولود۔

ج :- اس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے۔

یہ سب کچھ منظور ہو گیا اور آخر میں ان لوگوں پر لعنت پھٹکار درج کی گئی جن کا ایمان یہ ہے کہ ایک وقت تھا کہ مسیح نہ تھا۔ وہ اپنے تجسّم سے پہلے موجود تھا۔ وہ نیست سے ہست کیا گیا۔ باپ اور بیٹے کا ایک جوہر نہ تھا۔ وہ مخلوق اور تبدیل پذیر ہے یہ عقیدہ اتھاناسیس کی تشریح اور ان لعنتوں کے ساتھ کونسل میں منظور کیا گیا اور تمام بشپوں نے سوائے دو کے اس پر دستخط کر دیئے۔ سو ایریس مع ان بشپوں کے جلاوطن کیے گئے۔ اور الریہ کو بھیجے گئے اور حکم ہوا کہ ایریس کی تمام تحریرات جلائی جاویں۔" (صفحہ ۱۷۳ تا ۱۷۵)

ناظرین نے سطورِ بالا میں عیسائیوں کے عقائد میں اختلافات کی گرم بازاری کا حال خود ان کے ایک مصنّف کی کی زبانی ملاحظہ فرمایا۔ یہی اقتباس یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے اور "تین میں ایک" اور "ایک میں تین" ہونے کے تصورات آسمانی نہ تھے بلکہ انسانی ذہن کی تخلیق تھے جنھیں حضرت مسیحؑ سے تین صدی بعد ایک کونسل نے سندِ منظوری عطا کی۔ پادری صاحب نے تو صرف یہی لکھنے پر اکتفا کیا کہ اس عقیدہ سے اختلاف کرنے کے جرم میں ایریس اور دوسرے دو بشپوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مہمل عقیدہ سے اختلاف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ بعد میں بہت سے عیسائی فرقوں نے علی الاعلان اس کی مخالفت کی بستانی نے اپنے دائرۃ المعارف جلد ششم میں ان فرقوں کو نام بنام گنوانے کے بعد ان کے عقائد کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں (اور خود عیسائیت کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے) کہ

فرقہ ابونین نے واضح لفظوں میں کہا کہ حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے نہیں انسان ہیں اور خدائی میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

سابلیین نے کہا کہ اقانیم ثلاثہ توحید ہی کے اشارے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ نے مختلف پیرایوں میں اپنے لیے بیان کیا ہے۔

پھر باپ، بیٹا، رُوح القدس کے بارے میں بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت بنیادی اختلاف برپا ہوئے۔

آریوسیین نے کہا کہ حضرت مسیح باپ کی طرح ازلی نہیں وہ اس کائنات سے پہلے پیدا کیے گئے۔ مگر تھے وہ مخلوق ہی۔

مقدونین نے کہا کہ اقانیم صرف دو ہیں۔ رُوح القدس اقنوم نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔

یونانی کلیسا نے کھلے لفظوں میں اسے ماننے سے انکار کیا کہ روح القدس صرف باپ سے نہیں بلکہ باپ اور بیٹے سے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔

تیرھویں صدی عیسوی میں عمومیین، جرمانی، موحدین اور سوسینیانی نامی فرقوں نے بھی عقیدۂ تثلیث کو باطل قرار دیا۔

یونی ٹیرین فرقہ کے لوگ بھی صرف خدائے واحد کے قائل تھے۔ بعض فرقے تثلیث کے قائل تھے مگر روح القدس کی بجائے حضرت مریمؑ کو تیسرا اقنوم تسلیم کرتے تھے۔ آپ یہ معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہوں گے کہ یہ عقیدہ تثلیث ہے کیا؟ اقانیم ثلاثہ مل کر ایک کیسے ہوتے؟ عیسائی اپنے الفاظ میں اس کی کیا تشریح کرتے ہیں؟ آپ یقین مانیے کہ ہم بھی بلکہ بلا مبالغہ خود عیسائی فاضل بھی آج تک اس راز کو نہیں پا سکے۔ ان کے نزدیک یہ ایک خدائی بھید ہے جس پر بلا چون وچرا ایمان لے آنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ وہ تشریح کرتے بھی ہیں تو ایسی زبان اور ایسے اسلوب میں کہ بے اختیار یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

سرِ مستاں منطق الطیر است جامی لب بہ بند
جز سلیمانے نشاید فہم ایں گفتار را

دعائے عمیم نامی ایک کتاب میں عیسائی فضلاء نے اس عقیدہ کی یوں تشریح کی ہے:

"ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کریں۔ نہ اقانیم کو ملائیں نہ ماہیت کو تقسیم کریں، کیونکہ باپ ایک اقنوم، بیٹا ایک اقنوم، اور روح القدس ایک اقنوم ہے۔ مگر باپ بیٹے، اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر عظمت ازلی یکساں جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا ہے اور ویسا ہی روح القدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق، روح القدس غیر مخلوق، باپ غیر محدود۔ بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود۔

اسی طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔ یونہی باپ قادرِ مُطلق، بیٹا قادرِ مطلق اور روح القدس قادر مُطلق، تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسے ہی باپ خُدا، بیٹا خدا، روح القدس خُدا۔ تس پر بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خُدا۔ اسی طرح باپ خداوند، بیٹا خداوند اور رُوح القدس خداوند تو بھی تین خداوند نہیں بلکہ ایک خداوند۔ کیونکہ جس طرح مسیحی عقیدہ سے ہم پر فرض ہے کہ ہر ایک اقنوم کو جُداگانہ جُداگانہ خُدا اور خداوند مانیں اسی طرح دین جامع سے ہمیں یہ کہنا منع ہے کہ تین خُدا یا تین خداوند ہیں۔ باپ کسی سے مصنوع نہیں، نہ مخلوق نہ مَولُود۔

رُوح القدس باپ اور بیٹے سے ہے، نہ مصنُوع نہ مخلوق نہ مولُود، پر نکلتا ہے۔ پس باپ ایک ہے نہ تین باپ، ایک بیٹا ہے نہ تین بیٹے ایک روح القدس ہے نہ تین روح القدس اور اس تثلیث میں ایک دوسرے سے پہلے یا پیچھے نہیں۔ ایک دوسرے سے بڑا یا چھوٹا نہیں۔ بلکہ بالکل تینوں اقانیم باہم ازل سے برابر یکساں ہیں۔"

یہ ہے اس عقیدہ کی تشریح جو عیسائیوں کے نزدیک پروانۂ نجات ہے مگر اس مُعمّہ کا مطلب کیا ہے؟ کچھ خبر نہیں۔ روم کے پوپ صاحب نے حال ہی میں حضرت مریمؑ کو بھی اسی سلکِ مروارید میں پرو کر تثلیث کی بجائے تربیع کی کوشش کی تھی مگر افسوس کہ ان کی ندا صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

عام عقلِ انسانی اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ تین برابر ایک کے ہیں۔ اور ایک برابر تین کے ہے۔ بچہ بھی جانتا ہے کہ دو دونی چار ہوتا ہے۔ فرض کیجئے آسمان پر بھی یہ لکھا نظر آجائے کہ دو دونی پانچ ہیں تو حضراتِ نصاریٰ بھی دیگر اقوام عالم کی مانند یہی فرمائینگے

کہ یہ نوشتہ آسمانی غلط ہے۔ کوئی منطقی دلیل اس کو صحیح ثابت نہیں کر سکتی۔ ہمارے سامنے چاند چمک رہا ہو۔ لوگ اس کی تابانی و درخشانی کی تعریف کرتے نہ تھکتے ہوں ایک اور دوسرے صاحب تشریف لاکر یہ انکشاف فرمائیں کہ میری گھڑی پر اس وقت دن کے بارہ بج رہے ہیں تو خواہ وہ اپنی گھڑی کے ہر ہر پرزے کی توصیف میں انتہا درجے کی فصاحت و بلاغت ہی سے کیوں نہ کام لیں ہم ان کی تقریر دلپذیر سے متاثر ہو کر وجودِ ماہتاب کا انکار نہیں کریں گے کیونکہ اس کا دعویٰ حقیقتِ مسلّمہ اور ہمارے مشاہدہ کے خلاف ہے۔ عقیدۂ بالا میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ خدا حقیقت میں تین ہیں وہاں یہ بھی مرقوم ہے کہ خدا، مسیح اور رُوح القدس حقیقت میں ایک بھی ہیں۔ یہ ایک کا حقیقتہً تین ہونا اور تین کا واقعتہً ایک ہونا ایسا ظاہر البطلان ہے کہ ایک منٹ کے لیے بھی باور نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے عیسائی احباب اسے ماورائے عقل بات کہہ کر ان مابعد الطبیعاتی امُور میں شامل کرنا چاہیں جو ہماری عقل کی گرفت اور دسترس سے باہر ہیں تو اس پر ہم یہ گزارش کریں گے کہ یہ امر ماورائے عقل نہیں بلکہ بدیہی طور پر خلافِ عقل ہے۔ ماورائے عقل بات اپنے عجزِ فہم کا اعتراف کرتے ہوئے مانی جا سکتی ہے مگر جو بات صریحاً خلافِ عقل ہو ہم اسے کیوں کر تسلیم کر لیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ پاکستانی کرنسی کا ایک روپیہ، آٹھ دونیوں، چار چونّیوں، دو اٹھنّیوں اور ایک سو پیسوں کے برابر ہے، تو بے شک اسے تسلیم کر لیجیے مگر یہ کون مان سکتا ہے کہ یہ ایک روپیہ اپنے ہی جیسے ہم وزن ہم شان اور ہم قدر تین روپوں کے مساوی ہے۔ اگر عیسائی احباب کی منطق ہم سے یہ منوانے کے لیے مُصر ہو تو ہم اس کے سوا اور کیا عرض کریں کہ:

کیونکر اب اس نگہِ ناز سے جینا ہو گا:
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

اس سلسلے میں جو دلیل زیادہ سے زیادہ پادری صاحبان کو سوجھتی ہے وہ مثلّث

کا جیومیٹریکل مفروضہ ہے۔ وہ ایک نقشہ کھینچ کر بتا دیتے ہیں کہ دیکھیے یہ تینوں کا مجموعہ ایک ہے لہٰذا کہہ دو کہ تین برابر ایک ہے۔ اگر اس طرح کی مضحکہ خیز بچگانہ دلیلوں کا سہارا لیا جائے تو پھر ہم مربّع بنا کر کیوں نہ یہ دعویٰ کر دیں کہ توحید تربیع میں ہے اور تربیع توحید میں ہے کیونکہ ان چاروں لکیروں کا مجموعہ ایک ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے ایک مکان کے ایک جیسے سو کمرے ہوں۔ اس مکان پر کسی پادری صاحب کی نگاہ پڑ جائے اور وہ یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیں کہ سو برابر ایک کے ہے اور ایک برابر سو کے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عقل ایک لحظہ کے لیے بھی اس منطق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے؟ انسانی جسم ایک بدن، ایک رُوح اور ایک نفس سے مرکّب ہے۔ کیا محض رُوح انسان ہے؟ خالی جسم انسان ہے؟ صرف نفس انسان ہے؟ عیسائیوں کا خدا بھی باپ، بیٹا، روح القدس کا مرکب ہے۔ کیا ہر مرکب محتاجِ اجزا نہیں؟ کیا خدا بھی محتاج ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس مرکب کا اجزا اپنے علیٰحدہ وجود میں خدا کہلانے کا مستحق ہے؟ پھر کون سا مرکّب ایسا ہے جو مرکب بھی ہو اور حادث نہ ہو۔ نعوذ باللہ کیا خدا حادث ہے؟ اگر حیات نہ ہو تو بدن محض مٹی ہے۔ اگر بدن نہ ہو تو رُوح وہ کام نہیں کر سکتی جس کے لیے بدن کا ہونا لابُدی ہے کیا خدا کی بھی یہی شان ہو سکتی ہے؟

اناجیل اور تثلیث

ہمارے نزدیک موجودہ اناجیل سے بھی تثلیث کا عقیدہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اناجیل سے مسیحؑ کا مخلوق ہونا روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ زیادہ سے زیادہ باپ بیٹے کے الفاظ سے مغالطہ ہو سکتا ہے۔ اس کا ثبوت ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ ان الفاظ کا استعمال مجازی معنوں میں ہوا ہے۔ ہم اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے آپ کو تھوڑی دیر کے لیے اناجیل کے مُطالعہ کی زحمت دیں گے۔

۱۔ متی کی انجیل جمیل کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"یسُوع مسیحؑ ابن داوٗد ابنِ ابراہام کا نسب نامہ"

اس کا اختتام اس پر ہے:

"یعقوبؑ سے یوُسف پیدا ہوا۔ اور یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسُوع پیدا ہُوا جو مسیح کہلاتا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ جس کا نسب نامہ دیا گیا ہے، وہ خُدا کیونکر ہے؟ جو پیدا ہوا ہے اُسے غیر مخلوق کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی کتاب "پیدا ہوا" کہہ کر یہ ارشاد فرماتی ہے کہ مسیح کو غیر مخلوق کہو، اس کا یہ فرمان ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ اس تضاد کی تائید میں اگر آسمان سے بھی آواز آئے، ہم اسے ندائے ربّانی نہیں کہیں گے۔

۲۔ متی میں یہ بھی ہے کہ فرشتہ نے مریم کے منگیتر سے کہا:

"اے یوسف ابن داوٗد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔"

مریمؑ ابھی زوجہ نہیں صرف منسُوبہ ہے۔ اس کے پیٹ میں مسیح ہے جس کا وجُود "رہینِ منّتِ قدرت" ہے۔ اور وہ قدرت رُوح القدس سے ہے۔ اس سے رُوح القدس تو قادر ثابت ہوتا ہے۔ مگر مسیح نہیں۔ مسیحؑ "مقدور" ہے۔ پھر ہم اسے قادر کیوں تسلیم کرلیں؟

۳۔ متی ہی کا بیان ہے کہ مجوسی یہ سمجھ کر کہ یہودیوں کا بادشاہ پیدا ہوا ہے، اسے دیکھنے کو آئے۔ اوّل تو یہی غلط ہے کہ مسیح یہودیوں کے بادشاہ تھے۔ خیر اسے جانے دیجیے۔ مسیح پیدا ہوا کے الفاظ پر غور کیجیے۔ آخر ہم بقائمی ہوش و حواس ایک مولود کو غیر مولُود اور معبود کیونکر مان لیں؟

۴۔ مزید ارشاد ہے "بادشاہِ وقت کا نام ہیرودیس تھا۔ وہ اس بچہ کو قتل کرنا چاہتا

تھا فرشتہ نے یوسف سے کہا کہ اس بچّہ کو لے کر بھاگ جا۔" اگر انجیل مدعی ہے کہ اس بچّہ کا جلال خدائے ذوالجلال کے برابر تھا تو اس بچہ کو بھگا لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا خدا کا جلال بھی راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے؟

۵۔ متی باب چہارم میں لکھا ہے:

"ابلیس اسے مقدّس شہر میں لے گیا اور ہیکل کے کنگرے پر کھڑا کر کے اس سے کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے پھر ابلیس اسے بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور شان و شوکت اسے دکھائی۔"

۶۔ متی باب پنجم میں ہے، مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا:

"مُبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔"

بلاشُبہ جو لوگ اس وقت یہ کوشش کر رہے ہیں کہ تیسری جنگ نہ ہو ایسے کروڑوں انسان بقول متی خدا کے بیٹے کہلا سکتے ہیں۔ مگر عیسائی جسے اکلوتا بیٹا کہتے ہیں اسی کا بیان اس متی کے دسویں باب میں یہ ہے کہ:

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں، صُلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔"

گویا بقول مسیحؑ خدا کے بیٹے وہ ہیں جو صلح کراتے ہیں اور جو صُلح کرانے آیا ہی نہیں وہ خدا کا بیٹا نہیں کہلا سکتا۔ اگر اس تصریح کے باوجود انجیل اسے خدا کا بیٹا کہتی ہے تو کہنا پڑے گا کہ اس نے جو الفاظ مسیح کی جانب منسُوب کیے ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔

۷۔ متی کے باب ۲۳ میں ہے:

"مسیح نے اپنے شاگردوں سے فرمایا، تم ربّی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا اُستاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ

تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے اور تم ہادی کہلاؤ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔"

صاف ظاہر ہے کہ یہاں باپ اور بھائی کے الفاظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ روحانی باپ ایک ہے یعنی خُدا اور مسیح روحانی باپ یعنی خدا نہیں بلکہ ہادی یعنی سیدھی راہ دکھانے والا ہے۔

۸۔ مرقس کے باب دوم میں ہے:

"لوگ ایک مفلوج کو چار آدمیوں سے اُٹھوا کر مسیح کے پاس لائے۔ مسیح نے اس سے فرمایا، بیٹا تیرے گناہ معاف ہوتے۔"

ظاہر ہے کہ یہ مفلوج آپ کا نسلی صلبی بیٹا نہیں تھا۔ آپ نے اسے ازراہِ شفقت بیٹا فرمایا۔ اسی طرح جہاں جہاں مسیح کے لیے خدا کے بیٹے کے الفاظ وارد ہوتے وہ بھی مجازی ہیں اور ان سے حضرت مسیحؑ پر خدا کی شفقت اور کرم کا اظہار کرنا مقصود ہے۔

۹۔ اسی مرقس کے باب دس میں ہے کہ مسیحؑ نے فرمایا:

"مرد اور اس کی بیوی دونوں ایک جسم ہوں گے پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ کیا وہ حقیقت میں واقعی ایک ہی جسم ہیں؟ کیا یہاں بھی "دو برابر ایک کے ہے اور ایک برابر دو کے ہے" کا فارمولا لاگو کیا جائے۔ یا یوں کہا جائے کہ مرد بیوی ہے اور بیوی مرد ہے؟ اصل میں یہ سب شاعرانہ اور مجازی نوعیت کی باتیں ہیں۔ انھیں حقیقت پر محمول کرنا ٹھیک نہیں جس انجیل میں اس قسم کے محاورات استعمال ہوتے ہوں اس کے کسی ایسے ہی حوالے کی بناء پر یہ دعویٰ کرنا کہ مسیحؑ، خدا اور رُوح القدس حقیقتہً ایک ہیں سراسر غلط فہمی ہے۔

۱۰۔ اسی باب میں یہ لکھا ہے کہ:

"ایک شخص دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اس سے پوچھنے لگا، اے نیک استاد! میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں؟ یسوع نے اس سے کہا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے، کوئی نیک نہیں۔ مگر ایک یعنی خدا۔"

جس مسیح کا یہ قول ہے کیا وہ نیکی اور الوہیت میں خدا کا مساوی ہو سکتا ہے؟

۱۱۔ مرقس کے تیرھویں باب میں ہے، مسیح نے کہا:

"آسمان اور زمین ٹل جائیں گے۔ لیکن میری باتیں نہیں ٹلیں گی۔ لیکن اس دن یا گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ۔"

ظاہر ہے کہ مسیح یہ دعویٰ معمولی حیثیت سے نہیں کر رہے اپنی پوری شان سے کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ قیامت کا علم کسی فرشتے اور خدا کے کسی نیک بندے کو نہیں۔ س کو بھی نہیں جو اس کا بیٹا کہلاتا ہے۔ اگر اس کا علم ہے تو صرف باپ کو ہے۔ ان واضح اور بیّن الفاظ کے بعد کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ علم کے لحاظ سے روح القدس اور یسوع بھی خدا کے برابر ہیں۔

۱۲۔ اس سلسلہ میں یوحنّا کا باب ۱۴ بھی پوری توجہ چاہتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مسیح نے اپنے شاگردوں کو خوش خبری سے نوازا:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان رکھتا ہے، یہ کام جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا۔ بلکہ ان سے بڑے کام کرے گا۔"

ہم نہیں مان سکتے کہ مسیح کے شاگرد یا ان کے ماننے والے حواری ان سے بڑھ کر کام کر سکتے ہیں۔ مگر یہاں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اگر مسیح خدا ہوتے تو وہ یہ الفاظ ہرگز نہ کہتے کہ تم مجھ سے بڑے کام کر سکتے ہو۔ کیونکہ کوئی شخص خدا سے بڑے کام نہیں کر سکتا۔

۱۳۔ یوحنّا صاحب دسویں باب میں فرماتے ہیں:

"یسوع نے انھیں یہ جواب دیا کیا تمھاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں

نے کہا تم خُدا ہو اور جب کہ اس نے انھیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا اور کتاب مقدس کا باطل ہونا ممکن نہیں۔"

مراد یہ ہے کہ مسیح اور کلامِ مقدس کا اس پر اتفاق ہے کہ جن کے پاس خدا کا کلام آیا اُنھیں خُدا کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ جن کے پاس خُدا کا کلام آیا وہ حقیقی معنوں میں خدا نہیں تھے۔ انھیں مجازی معنوں میں خُدا کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اناجیل میں حضرت مسیح کے متعلق کسی جگہ خدا کا لفظ استعمال کیا بھی گیا ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

۱۴۔ یوحنّا کے آٹھویں باب میں ہے:

" انھوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا یسُوع نے ان سے کہا اگر خدا تمھارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے۔"

یہ الفاظ واضح کرتے ہیں کہ اکابرِ یہود نے دو دعوے کیے تھے ایک یہ کہ ہم حرام سے پیدا نہیں ہوتے۔ دوسرا یہ کہ ہمارا باپ خدا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک کوئی حرامزادہ فرزندِ خدا نہیں ہو سکتا تھا نیز خدا کو وہ اپنا باپ کہتے تھے حضرت مسیح نے ان کے دعویٰ کی تردید کی اور اس کے لیے دلیل یہ پیش فرمائی کہ چونکہ تم مجھ سے محبّت نہیں رکھتے ہو اس لیے تم خُدا کے بیٹے نہیں ہو سکتے۔ خدا کا بیٹا وہ ہوگا جو انجیل کی اصطلاح میں خدا جیسے کام کرے گا۔ مثلاً خدا مسیح سے محبّت رکھتا ہے، وہ بھی مسیح سے محبّت رکھے۔ اس تصریح کے ہوتے ہوئے اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہاں بیٹے کا لفظ جسمانی، مادّی یا نسلی رنگ میں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا استعمال سراسر معنوی نوعیت کا ہے۔ اب بھی کسی کو اس سچّائی کے قبول کرنے میں تامّل ہو تو مزید وضاحت کے لیے ہم سند کے طور پر خود حضرت مسیحؑ کا ایک قول پیش کریں گے

۱۵- یوحنّا کے اسی باب میں ہے:

"یسُوع نے ان سے کہا اگر تم ابراہام کے فرزند ہوتے تو ابراہام کے سے کام کرتے۔"

غور فرمایئے موجبہ کلیہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ابراہیم کے سے کام کرتا ہے وہ ابراہیم کا فرزند کہلانے کا مستحق ہے ہمارے خیال میں یہاں یہ دعویٰ کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ اس سے مراد معنوی فرزند ہے حقیقی فرزند نہیں، گویا بائبل کا عام محاورہ ہی یہ ہے کہ وہ اچھے کام کرنے والوں کو خدا کا بیٹا کہتی ہے۔ چنانچہ عہدنامۂ عتیق اور عہدنامۂ جدید دونوں کی رُو سے خدا کے ان گنت بیٹے ہیں اور انھی میں سے نمایاں تر کام کرنے والا اس کا اکلوتا بیٹا ہے۔

یہاں تک ہم نے انجیل کی مدد سے عقیدۂ تثلیث کا لایعنی اور لغو ہونا ثابت کیا۔ اب ہم مختصراً توریت یعنی عہدنامۂ عتیق کی رُو سے اس کا بطلان ثابت کریں گے۔

ہم اس سے پہلے اسی کتاب میں حضرت مسیحؑ کا یہ ارشاد نقل کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک توریت کا ایک شوشہ بھی قابلِ تنسیخ نہیں۔ وہ بالکل ایک برحق کتاب ہے۔ مگر ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ توریت کے ماننے والے یہود آج تک مسیحؑ کی اس مُصدّقہ کتاب کے اندر شمّہ برابر تثلیث کا سراغ نہیں پا سکے۔ ان کے نزدیک یہ عقیدہ رکھنا کھلا ہوا کفر ہے۔ ہمارے خیال میں کوئی عیسائی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ عیسائی یہودیوں سے بڑھ کر عبرانی زبان کے فاضل ہیں۔ یہودیوں کے اعتماد کا عالم تو یہ ہے کہ وہ نصرانیوں کے ترجمۂ توریت تک کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ عیسائی دُنیا فلسطین میں یہودیوں کی پشت پناہی کرنے کے باوجود اس سلسلے میں انھیں اپنے قریب نہیں لا سکی۔ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہو گا کہ انجیل کی تعلیم پر جتنی کڑی پابندی اسرائیلی سلطنت میں عاید ہے، اتنی اشتراکی ملکوں کے علاوہ کہیں

بھی نہیں۔ یہود توریت کی بے شمار تصریحات کی وجہ سے عقیدۂ تثلیث کے سخت مخالف ہیں۔ ہم نے توریت کے یہ حوالہ جات غالباً باب اوّل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے زیرِ عنوان جمع بھی کر دیئے ہیں۔ کیونکہ حضرت مسیح توریت کی تکذیب کرنے کے لیے نہیں بلکہ تصدیق کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ اس مقام پر ہم مثال کے طور پر صرف ایک حوالہ پیش کریں گے۔ استثنا۔ باب ۶، آیت ۴ میں ہے:

"میرے آگے تیرا دُوسرا خدا نہ ہووے، سُن لے اسرائیل! خداوند تمہارا خدا اکیلا خداوند ہے۔"

عبرانی زبان میں یہی عبارت عربی رسم الخط میں یوں ہے:

"شمع یسرائیل یہواہ الوہنو یہواہ آحاد۔"

مسیحؑ نے توریت کے اسی دعویٰ کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا:

"اے اسرائیل! سن وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے، ایک ہی خداوند ہے اور اس سے پیار کرو۔" (مرقس باب ۱۲ : ۲۹)

عربی انجیل میں اُردو کے ایک کا ترجمہ واحد سے کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ عربی کا واحد، عبرانی کا آحاد، اردو کا ایک اکیلا، مفہومِ تثلیث کا متحمل کیسے ہو سکتا ہے۔

بے جا تاویلات

ہم نے سطورِ بالا میں متعدد حوالہ جات سے یہ دکھا دیا کہ مسیح خدا نہیں وہ ابنِ آدم ابنِ داؤد اور ابنِ مریم ہے۔ وہ خدا کا جزو نہیں اس کا برگزیدہ بندہ ہے۔ ہمارے عیسائی دوستوں سے جب ان محکم دلائل کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو وہ مجبوراً ان اقوال کی تاویل کرنے لگتے ہیں اور ان واضح الدلالت باتوں کو ایسا مفہوم پہنانے کی

کوشش کرتے ہیں جو حد درجہ مبہم اور دور از کار ہے۔ اور ان کے مقابلے میں ایسے اقتباس پیش کرتے ہیں جن سے کھینچ تان کر اپنا مطلب برآمد کرنا آسان نظر آتے۔ اس طرح کی تاویلوں اور مقابلے کے حوالوں کی تفصیل پیش کرنا اپنا اور قارئین کا وقت برباد کرنے کے مترادف ہوگا۔ مثال کے طور پر صرف ایک حوالہ ملاحظہ فرمایئے:

یوحنا کی انجیل اس طرح شروع ہوتی ہے:

"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا سب چیزیں اسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔"

(باب ۱، آیات ۱، ۲، ۳)

علمائے تثلیث ارشاد فرماتے ہیں کہ یہاں کلام سے مراد خداوند یسوع مسیح کی ذات ہے اور وہ خدا ہے۔ آپ ان سے سوال کیجیے کہ آپ کا مفہوم کس الہامِ ربانی سے ماخوذ ہے؟ وہ یہ کہہ کر آپ کو خاموش کر دیں گے کہ "خاموش! خدا کی باتوں میں بولا نہیں کرتے۔ ہم ٹھیک نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ ایمان کا یہ ایک بھید ہے۔" (مسیحی تعلیم ص ۲۰) ہم عرض کریں گے کہ اگر ان کے نزدیک کلام سے مراد خدا ہے، "ابتدا میں کلام تھا" کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ ابتدا میں خدا تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا کا مطلب یہ ہوا کہ خدا خدا کے ساتھ تھا۔ پھر کہا گیا کہ کلام خدا تھا۔ گویا خدا خدا تھا اور یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ دوسرے لفظوں میں ابتدا میں خدا خدا کے ساتھ تھا اور سب چیزیں خدا کے وسیلے سے پیدا ہوئیں

اگر عیسائی احباب اس تشریح کو تسلیم کرنے میں متامل ہوں تو چلیے تھوڑی دیر کے لیے ہم ہی ان کے اس مفہوم کو مانے لیتے ہیں کہ ابتدا میں کلام تھا سے مراد یہ ہے کہ ابتدا میں مسیح تھا۔ مگر خدارا یہ بھی تو بتایا جائے کہ اس سے تثلیث کس طرح ثابت ہوئی؟ اس ٹکڑے سے تو زیادہ سے زیادہ دو خدا ثابت ہو رہے ہیں۔ ایک خدا دوسرا مسیح لیکن وہ تیسرا روح القدس کہاں چلا گیا؟ عیسائیوں کا مذہب تثلیث

تو سنا تھا یہ تثنیہ آج دیکھنے میں آیا کاش کہ عیسائی فضلاء کے ذہن میں یہ بات بیٹھ سکتی کہ خدا اور انسان کے علم میں کیا فرق ہے ؟ انسان کا علم جزئیات سے مستنبط ہوتا ہے۔ وہ استقراء سے کام لیتا ہے اور استقرا کی تعریف شرح تہذیب منطق میں یوں ہے۔ "الاستقراء تصفح الجزئیات لاثبات حکم کلی" ایک عام حکم لگانے کے لیے جزئیات کی چھان بین کرنا تصفح کہلاتا ہے اور اسی تصفح کا نام استقراء ہے۔ جب تک انسان، انسان ہے اس کے لیے پورا استقراء ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ قطعی و حتمی نہیں ہو سکتا۔ اس کے ہاں نقائص بھی پائے جاتے ہیں اور تضادات بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام کمزوریوں سے پاک اور صاف ہے۔ اسے کسی فیصلے کے لیے نہ استقراء کی ضرورت ہے نہ استنباط کی۔ لہذا اس کے علم میں تضاد کا گزر ہی ممکن نہیں۔ یا تو ان حوالہ جات کی روشنی میں صاف صاف تسلیم فرمالیجئے کہ تثلیث کو اناجیل سے ثابت کرنا ممکن نہیں۔ یا پھر یہ مانیے کہ آپ کے نزدیک خدا کے علم میں بھی نقص یا تضاد کا پایا جانا عین ممکن ہے۔ سیدھی سادی عبارتوں کو افلاطونی، سقراطی، بقراطی اور فیثا غورثی سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش نہ فرمایئے۔

آخر میں یہ بھی سنتے جایئے کہ عیسائیوں نے ان تین خداؤں کے ذمے ڈیوٹیاں کیا تقسیم کی ہیں :

ا:۔ باپ کا کام جہان کو پیدا کرنا اور رکھنا ہے۔

ب:۔ بیٹے کا کام نجات دینا اور کفارہ ہونا ہے۔

ج :۔ اور روح القدس کا کام انسان کے دل کو ایمان کے لیے مستعد کرنا اور ایمان لانے کے بعد اس پر قائم رکھنا ہے۔

اس تقسیم کار پر نظر ڈالنے کے بعد سوالات کا ایک ہجوم انسانی قلب و ذہن پر حملہ آور ہو جاتا ہے جو کام روح القدس کے سپرد کیا گیا ہے کیا وہ باپ یا خدا نہیں

کرسکتا؟ جو سب کچھ پیدا کرسکتا ہے کیا وہ ایمان کی استعداد پیدا نہیں کرسکتا ؟
رُوح القدس اسی کی مخلوق ہے یا نہیں ؟ اگر مخلوق نہیں تو اس کا خالق کون ہے ؟
اگر خدا ہی مسیح بنا تو پھر یہ دو کیونکر ہوئے ؟
بیٹا خود نجات دیتا ہے یا ذریعۂ نجات ہے ؟
جو اس سے پہلے پیدا ہوئے کیا وہ ان کے لیے بھی باعثِ نجات ہے یا نہیں ؟
اگر وہ نجات کے قابل اس وقت ہوا جب کفّارہ ہوگیا تو پہلوں کے لیے نجات کا موجب کیونکر ہوا ؟ کرے کوئی بھرے کوئی۔ گناہ دُوسروں نے کیے اور سزا مسیح نے بھگتی۔ کیا یہ خدا کے عدل کے منافی نہیں ؟ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک گناہ گاروں کا شمار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کے گناہوں کی تعداد کیا ہوگی ! اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ مگر چند لمحوں کی مصلوبیت کو ان سب گناہوں کا کفّارہ قرار دے دیا گیا۔ ایسا کیوں ؟ یہ کفّارہ مسیح کے ماننے والوں کے لیے ماضی کے گناہوں کا کفّارہ ہے یا ان کے ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں کے گناہوں کا ؟ اگر صرف ماضی کے گناہوں کا کفّارہ ہے تو اس کے لیے خدا کے بیٹے کو صلیب پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے ہر شریعت میں توبہ کی گنجائش موجود ہے۔ اگر مستقبل کے گناہوں کا بھی کفّارہ ہے تو یہ بات نہ دیکھی نہ سنی کہ گناہ سرزد ہونے سے پہلے انھیں معاف کرنے کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ کیا اس کے بعد مسیح کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کچھ بھی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟

کتاب پیدائش باب ۲، آیات ۱۶ تا ۲۰ میں ہے کہ جب حضرت آدمؑ اور حوّا سے جنّت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سرزد ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے :

"عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا، تُو درد کے ساتھ بچّے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ

پر حکومت کرے گا۔ اور آدم سے اس نے کہا چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹکٹارے اُگائے گی اور تو کھیت کی سبزی کھائے گا۔ تو اپنے مُنہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا۔"

اس ٹکڑے سے معلوم ہُوا کہ عورت کو دردِ زہ اور مرد کو مُشقّت سے روٹی کمانے کی سزا ان کے اوّلین گناہ کی پاداش میں ملی۔ سوال یہ ہے کہ جب مسیح کفّارہ بن چکے تو پھر مرد اور عورت کو یہ سزا اس وقت تک کیوں مل رہی ہے؟ کیا مسیح پر ایمان لانے والی خواتین دردِ زہ میں مبتلا نہیں ہوتیں؟ کیا عیسائی مردوں کو محنت کر کے روٹی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں؟

اگر مسیح کی عبودیت میں اُلوہیت شامل ہو سکتی ہے تو کیا خدا میں مسیح کی عبودیت داخل نہیں ہو سکتی؟ جسم محدود ہے۔ الوہیت غیر محدود۔ الوہیت مجسم ہو کر محدود ہوئی یا اسی طرح غیر محدود رہی؟

جس بطن میں مسیح تھے کیا اس میں الوہیت بھی تھی اور روح القدس بھی؟ جب مسیح بیٹا بن گیا تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ مسیح بھی بیٹا ہے اور خدا بھی بیٹا ہے اور روح القدس بھی بیٹا ہے؟ اگر خدا حضرت مریم کے بطن اقدس میں مسیح کے ساتھ نہیں تھا، تو یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ خُدا بصُورتِ مسیح مُجسّم ہُوا۔

اگر مسیح کفّارہ ہو گیا تو خدا کیسے بچ گیا۔ وہی تو بصورتِ مسیح مجسّم ہوا تھا؟ حضرت مسیحؑ خدا کی عبادت کرتے رہے اگر وہ مجسم خدا تھے تو عبادت کس کی کرتے تھے۔؟

اگر تثلیث کو تسلیم کر لیا جائے اور اربابِ ثلاثہ کی اس تقسیم کار پر ایمان لے آیا

جائے تو یہ اور اس طرح کے بے شمار اہم سوالات قدم قدم پر دامن پکڑنے لگتے ہیں۔ آپ عیسائیوں سے باصرار ان سوالوں کا جواب طلب کیجیے مگر وہ اُن گتھیوں کو سلجھانے میں ناکام نظر آئیں گے کہیں گے تو صرف اتنا کہیں گے:

"خدا میں تین شخص ہیں۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ خُدا اس پاک تثلیث کا پہلا شخص ہے جو بیٹے اور روح القدس کا شروع ہے۔ یہ تینوں شخص آپس میں برابر ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں اس لیے تینوں شخص یکساں الٰہی عزت کے لائق ہیں۔ یسوع مسیح سچّا خدا اور سچّا آدمی بھی ہے اور مقدسہ مریم مسیح مجسم خدا کی ماں بنیں۔ باپ خاص کر قادر مطلق اس لیے نہیں کہلاتا کہ وہ زیادہ قدرت والا ہے بلکہ اس لیے کہ پاک نوشتوں میں قدرت باپ کی، دانائی بیٹے کی اور پاکیزگی روح القدس کی کہلاتی ہے۔"

اس باب میں خود ایک مسیحی عالمِ دینیات (ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابلِ ملاحظہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں یسُوع مسیح (جیسس کرائسٹ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

"پہلی تین انجیلوں متی، مرقس، لُوقا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسُوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رُوح سے فیض یاب ہوا تھا۔ اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو مسیح تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی۔" (متی ۱۶ : ۲۲)

لُوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ صلیب کے بعد یسُوع کے دو شاگرد اماؤس کی

طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ خُدا اور ساری اُمّت کے نزدیک کلام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا۔ (لُوقا ۲۴ : ۱۹)

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجّہ ہے کہ اگرچہ مرقس کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ خداوند کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ ان کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسُوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان ہے مگر مرقس کی فدیہ والی عبارت ۔(مرقس ۱۰ ، ۴۵) اور آخری فسح کے موقعہ پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسُوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفّارہ سے کوئی تعلق تھا۔

"یہ بات کہ یسُوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، اناجیل کی متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔" (لوقا ۱۳، ۲۳)

وہ اکثر اپنا ذکر ابن آدم کے نام سے کرتا ہے۔ یسوع کہیں اپنے آپ کو ابن اللہ نہیں کہتا۔ اس کے دوسرے ہمعصر جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا ممسوح کہتے ہیں البتہ وہ اپنے کو مطلقاً بیٹے کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ مزید برآں وہ خُدا کے ساتھ ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے بھی باپ کا لفظ اسی اطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے۔ اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع

کے عمیق مطالعہ نے اُسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔"

"عید پنتوکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسُوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے۔ انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشو ونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک پیاس لگتی تھی۔ وہ تھکتا اور سوتا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا، اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا۔ اس نے دُکھ اٹھایا اور مرا۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے۔ درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصوّر کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعویٰ کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو وارداتیں گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو غیر حقیقی قرار نہ دیدیا جائے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان تمام حالات سے گذرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو وہ صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بناء پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں ٹل سکتی"، اس بات کا صاف صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خُدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی اہم شہادت ہے۔ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اس زمانے سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جب کہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح

کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسُوع پورے اختیارات کے ساتھ ابن اللہ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا۔ یہ ابن اللہ کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیّت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسُوع کو "خدا کا اپنا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیح کے لیے لفظ خداوند کا خطاب اصل ذہنی معنوں میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الذکر گروہ کا ہی ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ خداوند یسُوع مسیح کی طرف بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیئے جو قدیم کتبِ مُقدّسہ میں خداوند یہوہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکّب ہے۔ مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفوں کی صُورت میں۔ باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسُوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل

غیر واضح تھا تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکّب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی۔ بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔ یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ، بیٹے اور رُوح) کے درمیان تعلّق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں یونانی فکر کا نمونہ ہے۔"

اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون تاریخِ کلیسا کی یہ عبارت بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخرکار ۳۲۵ء میں نیقا کی کونسل نے الوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا۔ لیکن آخری فتح نیقاہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقا میں مسیح کا جو تصوّر قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث مسیحی مذہب کا ایک جزوِ لاینفک قرار دیا گیا۔ پھر اس دعوے پر کہ بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسّم ہوئی تھی، ایک دوسرا مسئلہ پیدا

ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث ومناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں۔ ایک الٰہی طبیعت اور دوسری انسانی طبیعت اور دونوں معتمد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوتے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں۔ یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا حامل ہے۔ اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی۔ اور یہ سوال مدتوں زیر بحث رہا کہ نجات کے معاملے میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا؟ آخر کار ۵۲۹ء میں اورنج کی دوسری کونسل میں یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا۔ جب تک وہ اس فضلِ خداوندی سے جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کرے اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسّل سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

مسیحی علماء کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداء میں جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت و محبت کا غلو تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے۔ خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں اور کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ حالانکہ حضرت مسیح کی تعلیمات میں

ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش کرتے انھوں نے اپنے گذشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو سراہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیح کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منطق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔

حرفِ آخر

گذشتہ ابواب میں ہم نے نہایت غیر جانبداری سے عیسائیت کے جو خط و خال واضح کیے ہیں انھیں نظر میں رکھنے کے بعد اس کتاب کا ہر انصاف پسند قاری اس معاملہ میں ہم سے اتفاق کرے گا کہ اس طرح کا مذہب کسی معقولیت پسند انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اس مذہب کی تبلیغ کے لیے کوشاں ہیں وہ انسانی اذہان و قلوب کی خدمت انجام دینے کی بجائے انھیں طرح طرح کے لایعنی الجھاووں میں مبتلا کرنے کا باعث بن رہے ہیں اور دیکھا جائے تو ان کی تبلیغی مساعی خود بائبل کے سراسر منافی ہیں۔ بائبل کے عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید میں اللہ تعالیٰ کو بنی اسرائیل کے خدا، اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان میں کہیں یہ ہدایت نہیں پائی جاتی کہ ان مذاہب کو عالمی پیمانے پر عام کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ سموئیل ۱، باب ۲۵ : ۳۲ میں ہے:

"خداوند بنی اسرائیل کا خُدا مبارک ہے جس نے تجھے بھیجا ہے کہ تُو آج کے دن میرا استقبال کرے۔"

سلاطین ۱ باب ۱ : ۴۸ میں ہے:

"خداوند بنی اسرائیل کا خدا مبارک ہے جس نے آج کے دن ایک آدمی ٹھہرایا کہ وہ میری آنکھوں کے دیکھتے ہوئے تخت پر بیٹھے۔"

تواریخ ۲، باب ۶ : ۴ میں ہے:

"خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے ہاتھ سے وہ کلام کہ جس کو اپنے مُنہ سے میرے باپ داؤد سے کہا تھا پورا کیا۔"

تواریخ ۱، باب ۱۶ : ۳۶ میں ہے :

"خداوند اسرائیل کا خدا ابدُالآباد مبارک ہو۔"

زبور ۷۲ : ۱۸ میں ہے :

"خُداوند خدا اسرائیل کا خدا جو اکیلا ہے عجائب کام کرتا ہے۔"

حضرت مسیح نے اپنے بارہ شاگردوں کو جو بنی اسرائیل ہی کے افراد تھے بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں کی طرف تبلیغ و تلقین کے لیے بھیجا مگر انھیں واضح لفظوں میں ہدایت کی :

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔"

(متی باب ۱۰ - ۶ تا ۸)

خود حضرت مسیحؑ بھی اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو صرف بنی اسرائیل تک محدود رکھتے تھے۔ دوسرے لوگ ان سے رحم کے طلب گار ہوتے بھی تھے تو اناجیل کے بقول وہ انہیں سختی سے ڈانٹ دیتے تھے۔ متی باب ۱۵ میں ہے :

"پھر یسُوع وہاں سے نکل کر صدر اور صیدا کے علاقے کو روانہ ہُوا اور دیکھو ایک کنعانی عورت ان سرحدوں سے نکلی اور پکار کر کہنے لگی اے خداوند ابن داؤد! مجھ پر رحم کر۔ ایک بدرُوح میری بیٹی کو بہت ستاتی ہے۔ مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔ اور اس کے شاگردوں نے پاس آکر اس سے عرض کی کہ اسے رخصت کر دے کیونکہ ہمارے پیچھے چلّاتی ہے۔ اس نے جواب میں کہا میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مگر اس نے آکر اسے سجدہ کیا اور کہا

اے خداوند میری مدد کر۔ اس نے جواب میں کہا لڑکوں کی روٹی لے کر
کتّوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔ (آیات ۲۱ تا ۲۷)

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوا کہ بائبل کے نزدیک عیسائیت یا یہودیت محض قومی مذاہب ہیں۔ انھیں دوسری قوموں میں پھیلانا ممنوع ہے۔ ان کی اشاعت کے لیے مختلف ملکوں میں مشن قائم کرنا حضرت مسیح کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ان واضح ہدایات کے باوجود عیسائی اپنے مذہب کی تبلیغ و توسیع کے لیے اس درجہ سرگرداں ہیں کہ اکثر و بیشتر انصاف و عدل سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ یوں بھی اگر عالمی مذہبی کوائف کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ عیسائیت کو دنیا بھر میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اب امریکہ، برطانیہ، اطالیہ وغیرہ کی عیسائی تبلیغی جماعتوں نے پاکستان میں اپنی کوششوں اور سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا ہے کیونکہ جب انسان حالات کی مجبوری کے تحت اکثر میدانوں سے محروم و مایوس ہو کر محض چند ایک مقامات کو اپنے لیے کھلا ہوا پاتے تو وہ انھیں غنیمت تصوّر کرتے ہوتے اپنی توقعات انھیں سے وابستہ کر لیتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ۱۹۱۷ء سے پیشتر روس نصرانیت کا ایک ممتاز مرکز تھا۔ ان دنوں حال یہ ہے کہ یہ سرزمین دہریت و مادیت کا شکار ہو چکی ہے۔ اشتراکیت کا یہ عظیم الشان جہان اور اس کے ہم نوا متعدد ممالک میں شب و روز یہ تبلیغ کرتے ہیں کہ مذہب ایک افیم ہے۔ مسیح کے نام سے کوئی شخصیت کرۂ ارض پر کبھی بھی جلوہ آرا نہیں ہوئی۔ اس خطہ کے دروازے مسیحیت پر بند ہو چکے ہیں اور جو ادارے اس اقلیم میں اپنے اعتقادات کی نشر و اشاعت کر رہے تھے انھیں اس مملکت کو خیرباد کہنا پڑا ہے۔ روس، پولینڈ، چیکوسلاویکیہ، زیگوسلاویہ، رومانیہ، بلغاریہ

لیتھونیا، ہنگری سے صلیب رخصت ہو چکی ہے۔ چین جو کسی زمانہ میں عیسائیت کا مسکن تھا، ان دنوں اس کا مدفن ہے۔ تبّت سے لامے راہ فرار اختیار کر چکے ہیں۔ عیسائی مشنریوں کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ کبھی ان کے لیے یہ برّاعظم بڑا ہی سازگار اور خوشگوار تھا

بھارت میں کسی پادری صاحب کو کسی ہندو کو بپتسمہ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ گوا بڑا ہی قدیمی مسیحی معبد تھا۔ لیکن وہاں کے عیسائی حضرات تو اپنی عزت، جان اور دولت کے بچانے کی فکر میں ہیں۔ گوا، دمن، دیو میں خداوند یسوع مسیح کا پیام کیونکر پیش کر سکتے ہیں۔ صورتِ حال تو یہ ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

برما نے اعلان کر دیا ہے کہ اس کا سرکاری مذہب بدھ دھرم ہوگا۔ پادریوں نے اس ٹکڑے کو نوآبادی بنانے کا ابتدائی کام کیا تھا۔ مگر اب انھیں دوبارہ بدّھوں کو عیسائی بنانے کی کیسے اجازت دی جا سکتی ہے۔؟

افریقہ سے مغربی طاقتوں کے قدم جوں جوں اٹھتے چلے جا رہے ہیں عیسائیت کے بلب بھی فیوز ہو رہے ہیں۔ ان کالوں کو گوروں سے بڑی نفرت ہے۔ حکومت تھی تو گرجے بھی آباد تھے۔ پادریوں کے تخت بچھے، موتے تھے۔ جب سلطنت ہی نہ رہی تو جو مذہب اس کے سائے میں پروان چڑھا تھا، اس کا حشر وہی ہونا چاہیئے تھا جو اب ہو رہا ہے۔ کلیساؤں کی جماعت کے ناظمِ اعلیٰ بصد حسرت اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ عربوں ہی پر اربوں ڈالر خرچ کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ خود یروشلم سے لے کر (جو خداوند کا شہر اور تختگاہِ داؤد ہے) افریقہ کے شمالی منطقوں تک کا حال یہ ہے کہ ہم ایک بھی مسلمان کو مسیح کی مقدس بھیڑوں میں شامل نہیں کر سکے۔ حالانکہ اس ناکامی سے عیسائیت کو سنبھلنا چاہیئے تھا اور اس کے مبلغین کو اپنا دامنِ تبلیغ سمیٹ لینا لازم تھا مگر انھوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے اور اپنی تبلیغی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔

وہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو پیدا ہُوئے۔ ابھی ان کی عُمر ۳۸ سال ہے مگر اڑتیس سال کی اس عُمر میں انھوں نے صدیوں پر مُحیط طویل مُسافتیں بھی طے کر لی ہیں اور ایک لمبی جدّوجہد کے ماحصل کو بھی سینے سے لگا لیا ہے۔

وہ ابھی نوعُمر طالب علم تھے کہ انھیں زندگی کی سخت ترین اُلجھنوں اور کشاکشوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ مگر وہ اپنے راستے کی مُشکلات پر ہمیشہ ہنسے۔ انھوں نے اندھیروں کو آنے والی روشنی کے تصوّر سے ہمیشہ خوش آمدید کہا۔

ان کا یہ ثبات اور اپنے اُوپر بھروسہ، ہمیشہ ان کے کام آیا۔ اور جب تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی اور عوامی جدّوجہد میں شامل ہُوئے تو یہاں بھی انھیں میرِ کارواں کے کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھنے کا شرف نصیب ہُوا۔

وہ عوام میں سے اُوپر کو اُٹھے ہیں اور آج جبکہ وہ عوامی حکومت کے ایک ذمّہ دار اور پُروقار وزیر ہیں، ہر لحظہ انھیں یہ بات یاد رہتی ہے۔

۱۹۷۰ء کے عوامی اِنتخابات میں جبکہ سیالکوٹ کے ستانوے ہزار لوگوں نے انھیں قومی اسمبلی کے لیے اپنا نمایندہ چنا تھا، تو انھیں ۵۱-۵۲ء کی وہ ساری تنہائیاں اچھّی طرح یاد تھیں جو لاہور کے بھرے بازاروں اور گنجان محلّوں نے ان کی جھولی میں اس وقت ڈالی تھیں جبکہ وہ نئے نئے اس شہر میں آئے تھے۔

وہ پنجاب کے پہلے اخبار نویس ہیں جنھوں نے "شہاب" کے ذریعے پنجاب کے ہفتہ وار اخبارات کی تاریخ میں کثرتِ اشاعت کے جو ریکارڈ قائم کیے تھے اسے آج تک کوئی توڑ نہیں سکا ہے۔

وہ پنجاب کے وہ شُعلہ بیان خطیب ہیں جن کی زبان بھی شُعلے اُگلتی رہی ہے اور قلم بھی روشنیاں بکھیرتا رہا ہے۔

وہ پہلے بھی مُجاہد تھے اور آج بھی مُجاہد ہیں۔ جہاد ہی ان کی زندگی کا نُقطۂ سفر تھا اور جہاد ہی ان کا مُنتہا اور منزلِ مقصُود ہے۔

ایمان افروز کتابیں

مولینا کوثر نیازی کے قلم سے

اسلام ہمارا دین

یہ تصنیف مولینا کوثر نیازی کے اُن قلبی احساسات و جذبات کی ترجمان ہے جو مولینا کے دِل میں اسلام کی ہمہ گیری و جہانداری کے باب میں اُس وقت سے پرورش پاتے رہے ہیں جب کہ ابھی وہ طالب علم تھے۔

سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ ——— صفحات 362 ——— قیمت 14.50

بصیرت

مولینا کوثر نیازی نے اپنی اِس تالیف میں کلام اللہ کی ایسی آیات کا اِنتخاب کیا ہے جو ہماری روزمرّہ زندگی سے براہِ راست رابطہ رکھتی ہیں۔ آپ نے کوزے میں دریا بند کرنے کا اسلوب اپنایا ہے اور ان آیات کی تشریحیں ایک ایک دو دو صفحوں میں سمیٹ لی ہیں جنھیں بیان کرنے کے لیے مفسّرین نے اجزا کے اجزا لکھ ڈالے اور بات پھر بھی تشنہ رہی۔

سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ ——— صفحات 250 ——— قیمت 10.50

بُنیادی حقیقتیں

مولینا کوثر نیازی اِسلام کے سچّے اور مخلص مُبلّغ ہیں۔ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے اِسلام کی تبلیغ کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے اور اِسلام کے بُنیادی حقائق عوام کے سامنے مختصر الفاظ میں اس طرح پیش کیے ہیں کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔

سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ ——— صفحات 150 ——— قیمت 6.50

آئینۂ تثلیث

مولینا کوثر نیازی نے اپنی اِس تصنیف میں عیسائیت کے اصل حقائق کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اُن عیسائی مشنریوں کو آئینہ دکھایا ہے، جو آدمیّت کی نجات کے بہانے بھولے بھالے لوگوں کو گمراہی کے گڑھوں میں دھکیلتے ہیں۔ اور ایسے عقائد کا پرچار کرتے ہیں جن کا حضرتِ مسیحؑ کی تعلیمات سے دُور کا بھی تعلّق نہیں۔

قیمت 6.25

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور